ادارۂ اشاعت اردو

عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

ماہنامہ پیام ادب، اکتوبر ۱۹۴۳ء
ہماری نئی مطبوعات
مضامین عبدالماجد دریابادی
روحِ اقبال
یقین و عمل
زمان و مکان
اقبال کا تصور
جناح کے نام
اقبال کے خطوط
گرداب
از احمد ندیم قاسمی
چین جمہوریہ
سیاست جاپان
اقبال سلیم گاہندری
مینجنگ ڈائرکٹر
ادارۂ اشاعت اردو
عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

ماہنامہ
پیامِ ادب
جلد (۱)
نمبر (۲)
ماہ اکتوبر ۱۹۴۳ء
منیجنگ ڈائرکٹر
چودھری اقبال سلیم گاہندری
ناشر
مدیر مسئول
سید عبدالوہاب
ادارہ اشاعتِ اردو
عابد روڈ حیدرآباد دکن
فی پرچہ آٹھ آنے
چندہ سالانہ چھ روپیے
مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

مندرجات

نظرات

"پیام ادب" کا یہ دوسرا شمارہ پیش ہے۔ اس شمارہ میں صفحات کسی قدر زیادہ ہیں، اور مضامین بھی زیادہ متنوع انداز کے اکٹھے کیے گئے ہیں۔ حتی الامکان کوشش کی جا رہی ہے کہ ہر دوسرا شمارہ پہلے شمارہ سے زیادہ بہتر پیش کیا جا سکے۔ یہ ہمارا ارادہ اور ہماری کوششیں ہیں، ہمیں یقین ہے کہ ہم کامیاب رہیں گے۔ لیکن اس کامیابی میں ناظرین کی امداد بھی ضروری ہے۔

اِس ماہ کے مضامین میں حضرت محمود محتسب کا مضمون حضرت جوش ملیح آبادی کے مضمون مندرجہ رسالہ ایشیا بابت اگست ۱۹۴۳ء کا جواب ہے، اور ترکی بہ ترکی جواب ہے۔ لب و لہجہ یقیناً کسی قدر تلخ ہو گیا ہے، لیکن خود حضرت جوش کا مضمون جس قدر گستاخ اور جتنا تلخ ہے اُسے دیکھتے ہوئے محتسب صاحب کے مضمون کو تلخ نہ کہا جا سکے گا۔ حضرتِ جوش اپنے جوش میں وہ سب کچھ کہہ جاتے ہیں جسے برداشت نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا جواب میں وہ سب کچھ سننا پڑے گا جس سے انھیں خود بھی تکلیف ہوگی۔

مہمل نوائی و مخش نگاری کا جو طریقہ "ترقی پسندی" کے خوشنما پردوں میں رائج کیا جا رہا ہے، ہماری رائے میں اُس کے متعلق صرف اتنی بات پر غور کرنا ضروری ہے کہ آخر اس کی افادیت کیا ہے؟ اور اگر اس سے کسی خاص فائدہ کی اُمید نہیں تو پھر کیا ضرورت ہے کہ اِس مہمل نوائی و مخش نگاری کو برداشت کیا جائے۔

اس ماہ کے افسانوں میں "نیم وا دریچے" "فولادی حلق" "غصہ کی گھڑی" اور "منزل مقصود" شامل ہیں یہ افسانے مشاہیر افسانہ نگاروں کے افکار اور ادیبانہ گلکاریوں کے نتایج ہیں، فسانوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ خالص ادبی نقطۂ نظر سے اُنھیں بہترین افسانے کہا جا سکتا ہے۔

"حکیم الشعرا امجد حیدرآبادی" نوجوان ادیب جناب محبت ایم۔ اے کا مقالہ ہے، اور تحقیق و تنقید کے معیار پر ایک اعلیٰ مقالہ کا مقام رکھتا ہے۔ یہ سلسلہ کا مضمون ہے، آئندہ بھی اُس کے اجزا، شایع ہوں گے۔

اِس ماہ نظموں کا معیار بہت بلند ہے۔ علی اختر، ماہر اور اشرف جامی، صائب و فیض کے افکارِ جمیل اس شمارہ کی زینت ہیں۔ ایک نظم "خطاب بہ اسلامیان" کے عنوان سے ہمارے بزرگ اور جامعہ عثمانیہ کے سابق صدر کلیہ مولوی عبدالرحمن خاں صاحب کی بھی اس شمارہ میں شایع کی جا رہی ہے۔ مجلس علم و فضل کے صدر نشین کو بزم شعر و سخن میں بھی بلند و رفیع مقام حاصل ہے۔ شاید بہت کم لوگ اس سے باخبر ہوں گے۔ ادارۂ "پیام ادب" اِس کے لیئے موصوف کا شکرگزار ہے۔

آئندہ شمارہ سے "پیام ادب" کو مخصوص ابواب اور جدید تقسیم مضامین کے ساتھ شایع کیا جائیگا تاکہ اس کی افادیت اور زیادہ ہو سکے ادارہ ممنون ہوگا اگر ارباب ذوق اِس سلسلہ میں ہمیں اپنے قیمتی مشورے دیں تاکہ رسالہ کو زیادہ مفید اور دلکش بنایا جا سکے

اِدارہ

ادب و احتساب

ترقی پسند ادب کا عذرِ گناہ بدتر از گناہ

مرضِ غلامی کی نازک ترین علامتیں اس وقت پوری طرح ظاہر ہونے لگتی ہیں جب کوئی قوم سیاسی و معاشی غلامی کی اسفل ترین سطح پر پہنچ جاتی ہے اور یہ مرض افکار و خیالات کو متاثر کر دیتا ہے، اس وقت غلام اپنے آقا کی آنکھ سے دیکھتا اور اپنے آقا ہی کے دماغ سے سوچتا ہے۔ مریض کی اس کیفیت میں اگر امید کی کوئی کرن دکھائی دیتی ہے تو صرف یہ کہ اس وقت کچھ غیرت مند طبائع میں ایک قسم کا سخت انکار اور صورتِ حال کے خلاف ایک زبردست ابا پیدا ہو جاتا ہے، پھر اگر اس غیرت و ابا کے لئے ترقی کا موقع میسر آ جائے تو اصل مرض یعنی دماغی غلامی کا آہستہ آہستہ اِزالہ ہونے لگتا ہے۔

ہندوستان تقریباً ڈیڑھ سو سال سے سیاسی و معاشی غلامی میں مبتلا ہے۔ دماغی غلامی کا دور انیسویں صدی کے آخری حصہ یعنی تقریباً پچاس سال سے شروع ہوتا ہے، یہ وہ وقت ہے جب کہ ہمارے کان "دانایانِ فرنگ" اور "مہذب اقوام" جیسے الفاظ اور جملوں سے آشنا ہوئے، اور پچھلے پچیس سال میں تو ہمارا ادب اس سے بری طرح متاثر ہوا۔ بہت سے ایسے "ادبا" اور "شعراء" پیدا ہوئے جن کے قلب و دماغ دوسروں کی غلامی سے پوری طرح متاثر تھے۔ حد تو یہ ہوئی کہ انگریزوں کی مخالفت کا جذبہ بھی انگریزوں کے مخالفین کی غلامی سے آزاد نہ رہا، ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس سے اثر پذیری اس درجہ بڑھ گئی کہ ان بدنصیب "ادبا" و "شعراء" کے پاس روسی نظام کی مدح سرائی اور اشتراکی فلسفۂ حیات کی تعریف و توصیف میں مبالغہ آمیزی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی حیات بالکل بے بنیاد و بے اساس تھی نہ ان کے پاس انفرادی حیات کے لئے کوئی قاعدہ تھا اور نہ اجتماعی زندگی کا کوئی نقشہ، ان کا جسم انگریزوں کے دستِ اقتدار میں اور ان کی فکر و بصیرت روسی اشتراکیوں کے پنجۂ آہنی میں قید ہے، بیچاروں کے پاس اپنا کچھ نہیں ان کے "ادیبوں" نے مضامین لکھے تو ٹراسکی اور چیخوف کی نقالی کی، اور ان کے شاعروں نے نظمیں کہیں تو ان میں اشتراکیت کے لئے باب المدیح اور انگریزوں کے لئے "باب الہجا" کا طومار اکٹھا کر دیا۔

ضد کا برا ہو، انسان کو کسی کام کا نہیں رکھتی۔ "انقلاب" "انقلاب" کے ہنگاموں نے ہر بیٹے کو باپ کے خلاف آمادہ کیا، اور ہندوستان کے "نونہال" صدیوں کی تعمیر شدہ عمارتوں کو غصہ کے بحران میں مسمار کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ پچھلے اربابِ قلم اخلاق و کردار کو حیاتِ انسانی میں بڑا مرتبہ دیتے تھے، اب ضد کا تقاضہ یہ ہے کہ اخلاق و کردار کے تصورات کی دھجیاں بکھیر دی جائیں۔ فواحش کی اشاعت بری بات سمجھی جاتی تھی، "ترقی پسند ادب" اسی کو کہتے ہیں کہ اب فواحش کی پوری قوت کیساتھ اشاعت کی جائے۔ صدیوں سے شعراء نے اوزان، بحور، ردیف اور قوافی کو اشعار میں لازمی قرار دے کر اپنی نفاست پسندی، ہم آہنگی اور موسیقیت

کا ثبوت دیا؛ اِس کے جواب میں "بلینک ورس" کو اُردو میں رائج کیا جائے، اور اس شان سے اس میں خامہ فرسائی کی جائے جیسے ماشاءاللہ یہ ترقی پسند اَدب کا بالکل اپنا ہی "اِجتہاد" ہو۔ خدا اور مذہب کے فرسودہ خیالات کو مٹا دیا جائے۔

طفلانہ ضد، ہٹ، غصہ، اور ناکام جھنجلاہٹ کی کتنی واضح مثالیں ہیں!

جیساکہ ابھی بیان کیا جاچکا ہے اس وقت غیرتمند دماغوں میں صورتِ حال کے خلاف اباء اور نفرت کا شدید جذبہ پیدا ہونا لازمی تھا؛ پیدا ہوا اور آج سارے ہندوستان میں کوئی سنجیدہ آدمی ایسا نہیں جو اس "ترقی پسند اَدب" سے کلّی یا جزوی اِختلاف نہ رکھتا ہو!

۱۰ اگست ۱۹۴۳ء کو بمبئی اُردو اِصلاحِ اَدب کی ایک کانفرنس ہوئی، جناب ماہرالقادری نے اِس کی صدارت کی اور راجہ صاحب محمود آباد نے اس کا اِفتتاح کیا، اِس کانفرنس میں "ترقی پسند اَدب" کے خلاف تقریریں ہوئیں اور اس کو گمراہ کن بتایا گیا، کانفرنس کی رپورٹ ایک نشرہ کی صورت میں شائع ہوئی۔ اِس نشرہ کو دیکھ کر ہماری زبان کے مشہور شاعر حضرت جوش ملیح آبادی کو بڑا ہی سخت غصہ آیا، اور حضرت جوش نے رسالہ "ایشیا" بابتہ اگست ۱۹۴۳ء میں کانفرنس اور اُس میں کی ہوئی تقریروں کے خلاف پورے سولہ صفحات میں دل کی بھڑاس نکالی ہے سارے مضمون پر ایک زبردست غصہ طاری ہے اور یورپین اَدب سے مضمون نگار کی شدید مرعوبیت ظاہر ہوتی ہے قبل اِس کے کہ حضرت جوش کے دلائل کا جائزہ لیا جائے اور اس کی صحیح قدر و قیمت بتائی جائے ایک بات یاد رکھنی چاہیئے کہ نثر نگاری میں ہمارے شاعر کا عجز کافی نمایاں ہوتا ہے۔ صاف سیدھی سی بات کو بھی اُن کی تحریر سے واضح طور پر نکالنا آسان نہیں۔ اور میری تو ہمیشہ سے یہ رائے ہے کہ حضرت جوش نثر لکھ کر اپنی صلاحیتوں کا خون نہ کیا کریں تو بہتر ہے۔

کہا جاتا ہے کہ شاعری کے لیئے معمولی مطالعہ اور فطری ملکۂ شعر و شاعری کافی ہوتا ہے لیکن نثر نگاری کے لئے خصوصاً جب کہ فلسفیانہ کلیات کے ذریعہ کسی بات کو ثابت کرنا مقصود ہو اِتنے کم تر درجہ کا مطالعہ کافی نہیں ہوتا۔

خدا نخواستہ میرا مقصد حضرت جوش کی تجہیل نہیں، میں اُن کو بڑا اچھا شاعر مانتا ہوں، اُن کے اشعار کو بڑے شوق کے ساتھ پڑھتا ہوں۔ حضرت جُوش کے اِشعار اگر مجھ سے زیادہ کسی شخص کو یاد ہوں گے تو شاید خود حضرت جوش کو۔ لیکن پھر بھی اُنھیں اچھی طرح یہ چیز ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ "ہر مردے وہر کارے" جو کام اُن کے بس کا نہیں اُس میں دخل نہ دیا کریں۔ وہ حیات کے مختلف مظاہر اور جذبات کی مختلف موجوں کی تصویریں اپنی شاعری میں پیش کیا کریں، یہی اُن کا بڑا احسان ہے، ہم اُن کے افعال نہیں اُن کے افکار سے اِستفادہ کریں گے۔ اَدبیات میں قیادت کی خدمت کا انجام دینا اُن کا کام نہیں، یہاں حساس قلب ہی نہیں بلکہ وسعتِ مطالعہ اور فکرِ بلیغ کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔

اَب ذرا حضرت جوش کے دلائل و براہین کو جانچیے اور اُن کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ لگائیے۔

حضرت جوش نے کانفرنس کے مذکورہ نشرہ سے "ترقی پسند اَدب" کے خلاف حسبِ ذیل پانچ الزامات اخذ کرکے اُن کے جوابات دیئے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

"اِن اِقتباسات سے واضح ہوتا ہے کہ شرکائے جلسہ کو بہت رنج و غصہ ہے اِس بات پر کہ:-

(۱) مغرب زدہ گمراہ ترقی پسند اَدب "اَخلاق و کردار" کو برباد کر رہا ہے۔

(۲) زبان میں بے جا تصرفات کرکے اَدب کو تباہ کر رہا ہے۔

(۳) فواحش کی اِشاعت کر رہا ہے۔

(۴) بلینک ورس کی سی ناموافق مزاج اُردو چیز کو جو بہت ہی گھٹیا اور مضحک ہے رواج دے رہا ہے اور

(۵) خدا اور مذہب کی توہین کرکے دل آزاری کا

ارتکاب کر رہا ہے۔"

حضرت جوشؔ کو یہ تو تسلیم ہے کہ "ترقی پسند ادب" کے خلاف یہ الزامات صحیح ہیں، فی الواقع "ترقی پسند ادب" ان تمام جرائم کا مجرم ہے، لیکن آپ کا خیال ہے کہ گناہوں کی اس فہرست میں کوئی ایسا گناہ نہیں جو پہلے ہی سے نہ کیا جا رہا ہو بلکہ یہ گناہ بطور سنت مستمرہ ہمیشہ سے ہو رہے ہیں اور ہمیشہ ہوتے رہیں گے، اس لئے اُن کے خلاف کوئی آواز اُٹھانا یا کوئی احتساب قایم کرنا فضول ہے، حماقت ہے، ایسی باتوں کے خلاف تو "رنج و غصہ" ہونا ہی نہ چاہیئے۔ گویا یوں سمجھیئے کہ:۔

حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں ہابیل و قابیل کے مابین اختلاف اور ایک کا دوسرے کو قتل کر دینا چونکہ بہت معروف اور صحف سماویہ کی شہادت کے بعد تو مسلّم ہے اور اس وقت سے اب تک ایسا کوئی زمانہ نظر نہیں آتا جب کہ قتل و خوں ریزی نہ ہوئی ہو، کمزور کا گلا قوی کے آہنی پنجوں سے دبایا نہ گیا ہو۔ اس لئے قاتلوں اور سفاکوں کے خلاف کوئی آواز اُٹھانا فضول ہے، حماقت ہے، اور رنج و غصہ کا مقام تو یقیناً نہیں۔ وغیرہ وغیرہ

غرض کہ جس جرم کی سند تاریخی مل جائے اور اس کا استمرار بھی ثابت ہو جائے، اس کے خلاف کوئی آواز نہ اُٹھائی جائے یہ ہے حضرت جوشؔ کے جوابات کا خلاصہ:

اتنا ہی نہیں بلکہ ذرا حضرت جوشؔ کی فلسفیانہ موشگافیوں کو بھی ملاحظہ فرمایئے علم الاخلاق اور ترقی پذیر بلکہ مبدل مجامات پر قلم فرسائی فرماتے ہوئے کیا کیا موتی بکھیرے ہیں جیسے نام خدا عمر بھر میں کبھی کوئی سنجیدہ لمحہ بسر بھی کیا ہو۔ فرماتے ہیں:

(۱) یہ اعتراض کہ ترقی پسند ادب اخلاق و کردار کو برباد کر رہا ہے، غلط ہے، اس بنا پر کہ "اخلاق و کردار" محض ایک اضافی چیز ہے اُسے حقیقت کی طرح کوئی اٹل اور معین مقام نہیں دیا جا سکتا، اخلاق و کردار اور پاکیزگی کوئی مقدس پارسل نہیں ہے جو آسمانوں سے اُترا ہے اور جس میں مجال نہیں کہ کسی قسم کی کمی بیشی یا تبدیلی کی جائے، بلکہ اس کے قطعی برخلاف کردار اور پاکیزگی ہمیشہ پنچوں کی بلی رہی ہے اور زمانہ اپنی سنت جاریہ کے تحت بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ اخلاق و کردار کے مفاہیم و تعینات کو بھی ہمیشہ بدلتا رہا ہے اور بدلتا رہے گا۔ ابھی تک تو اخلاق و کردار کے سلسلہ میں صرف مفاہیم و تعینات ہی کی تبدیلیاں ہوئی ہیں پرانے نام ابھی تک باقی ہیں، لیکن آثار و قرائن پیش گوئی کر رہے ہیں کہ آگے چل کر یہ نام بھی بدل جائیں گے۔"

"صرف اخلاق و کردار اور پاکیزگی ہی پر موقوف نہیں وقت کی جنبش مژگان خشکی و تری اور تمام مادی و ذہنی چیزوں کو حسب سابق بدلتی اور نئے سانچوں میں ڈھالتی رہتی ہے۔"

یہ ہمارا آئے دن کا ٹھوکا بجایا ہوا تجربہ و مشاہدہ ہے کہ ماضی کے بہت سے "محاسن" حال کے معائب اور حال کے بہت سے "معائب" مستقبل کے محاسن میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔"

اور جب عظیم و کارفرما وقت کی یہ ایک مستقل فطرت اور محکم اُفتاد مزاج ہے تو عصر حاضر کے بدلتے ہوئے "اخلاق و کردار" سے دانشمندی یہی ہے کہ مصالحت کر لی جائے اور ان جوان سال ادیبوں پر سب و شتم نہ کی جائے جو وقت کی پیداوار اور نئی زندگی کی فصل بہار کے پھل پھول ہیں اور نئے "اخلاق و کردار" کی تعمیر میں حصہ لینے کی "عبادت" میں مصروف ہیں۔"

یہی حی و قیوم وقت جو آج ہمارے جواں سال و جواں بخت ترقی پسندوں سے کام لے رہا ہے، ہمارے اسلاف سے بھی یادش بخیر یہی کام لے چکا ہے اور اسی طرح ہمارے اسلاف کے اسلاف بھی اپنے نئے زمانہ میں

اِس مقدس مشن کو پورا کرتے رہے ہیں؛

آج کل کے نوجوانوں پر تیر چلانے والوں کو اس کا مطلق خیال نہیں رہتا کہ نام خدا ان کے تیر کس طرف اور کتنی دُور جا رہے ہیں"

ع "کجا می نمائی، کجا می زنی"

جناب جوش کی محولہ بالا عبارت کا ماحصل یہ ہے کہ:

(۱) "اخلاق و کردار" محض ایک اضافی چیز ہے؛

(۲) "اخلاق و کردار" کا مفہوم بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔

(۳) ہمیشہ سے ہمارے بزرگوں نے بھی اپنے اپنے زمانے میں اخلاق و کردار کے مفاہیم و تعینات میں تبدیلیاں کی ہیں۔

(۴) اِس لیئے عصر حاضر کے بدلتے ہوئے "اخلاق و کردار" سے مصالحت کر لی جائے۔

ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیے اِس جگہ حضرت جوش کا دماغ کس طرح الجھ کر رہ گیا ہے۔ مجھے تفصیل کے ساتھ اخلاقیات پر بحث کرنا مقصود نہیں لیکن مختصر طور پر عرض ہے کہ جناب جوش کا پہلا نظریہ ہی غلط ہے "اخلاق و کردار" محض ایک اضافی چیز نہیں بلکہ ایک اٹل حقیقت ہے اور ایک مسلمہ اصول کے ساتھ قایم ہے جس سے بنی نوع اِنسان کو سرتابی کی مجال نہیں۔

فلسفیوں کی ہزار سالہ دماغی کاوشوں کو جانے دیجئے اتنا تو ہر اِنسان سمجھ سکتا ہے کہ اخلاق کی بنیاد اِنسانی مساوات اور مامونیت پر قایم ہے، ہمارے نزدیک تو افعال و اعمال کا معیار مذہب ہے لیکن بڑے سے بڑا حواس باختہ ناآشنا بھی اِس اصول سے منحرف نہیں ہو سکتا کہ افعال و اعمال کے درست و نادرست ہونے کا معیار فلاح نوع اِنسانی اور دوسرے افراد کے حقوق کا تحفظ ہے، ہر وہ فعل غلط، مضر اور نادرست سمجھا جائے گا جس سے کسی دوسرے اِنسان کا حق متاثر ہوتا ہو، یا جس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ نوع اِنسانی کی فلاح مقصود نہ ہو۔

کون صحیح المزاج شخص کہہ سکتا ہے کہ کسی فعل کی صحت کے لیئے فاعل کی خواہش یا تمنا خود معیار قرار پا سکتی ہے؟

"اخلاق و کردار میں جو جزئی تبدیلیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں وہ اِنکو محض ایک اِضافی چیز قرار نہیں دے سکتی ہیں۔ حضرت جوش کو "فکر غیر عمیق" نے اجازت نہ دی ورنہ دو ہزار سال کے محاسن و معایب کی چھان بین اُن کو اُصول تک پہنچا سکتی تھی، اور اُنھیں صاف نظر آجاتا کہ ایک "اُصول مشترک" اور ایک "قاعدۂ کلی" اِن تمام تبدیلیوں پر حاوی جس سے سرتابی کی مجال نہ حضرت جوش کو ہے اور نہ کسی دوسرے فرد اِنسانی کو"

(۲) اخلاق و کردار کے مفاہیم و تعینات زمانے کے ساتھ بدلتے نہیں بلکہ زیادہ واضح ہوتے جاتے ہیں، اور اُن میں ہمیشہ "اُصول اخلاق" کارفرما ہوتا ہے۔ کسی خاص فرد یا خاص جماعت سے جب اِس اصول سے عملی سرتابی کا جرم سرزد ہوتا ہے تو دنیا کے دوسرے افراد و جماعتیں اُس کے خلاف قلبی و عملی جہاد کرتی ہیں، اور تاریخ کے اوراق میں اُن کی گھناؤنی تصویریں پیش کی جاتی ہیں تاکہ دوسرے اُن اعمال سے بچیں۔ کیا حضرت جوش کو معلوم نہیں کہ کسی قوم نے دھاڑیوں، رقاصاؤں اور سیاہ کاروں کو قومی ہیرو کا مقام نہیں دیا ۔ کیا آج بھی اِس بدلتے ہوئے زمانہ میں کسی فلم ایکٹر کو عظمت کا وہ مقام عطا ہوا، جو نیکوکار اور خدمت خلق کرنے والوں کو دیا جاتا ہے؟

(۳) پچھلے زمانہ میں لوگوں نے تبدیلیاں کی ہیں، اِس سے کون اِنکار کر سکتا ہے لیکن اُنھیں ہمیشہ مجرم ہی کا مقام دیا گیا ہے، اور اُن کے خلاف خود جناب جوش کے جذبات بھی اُس کے سوا کچھ نہیں، کیا جوش صاحب نے اودھ کی رنڈیوں اور گانے والیوں کو وہی مرتبہ دیا ہے جو اِس زمانہ کی کسی شریف خاتون کو ملتا ہے، کیا واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کو اسی خاندان کے آصف الدولہ کا مقام ملتا ہے۔

اُصولی طور پر کسی عمل کا ایک مدت سے جاری رہنا جواز کی سند ہوسکتا ہے؟ یہ کیا مہمل دلیل ہے کہ بددیانتی، فحاشی اور دروغ بافی چونکہ ہمیشہ سے ہوتی رہی ہے، اِس لیئے اب اُن اعمال کو برا نہ کہا جائے؟

(۴) عصرِ حاضر کے بدلتے ہوئے "اخلاق و کردار" سے کس طرح مصالحت کرلی جائے؟ وہ کیا اُصول ہیں جن پر اُن بدلتے ہوئے "اخلاق و کردار" کی بنیاد قایم ہے؟ کیا خدانخواستہ اُس کے لیئے "لذت گیری" کو معیار قرار دیا جائے اور کیا افعال و اعمالِ انسانی کی صحت کا دار و مدار "لذت" قرار پائے۔ حضرت جوشؔ غور فرمائیں کہ افراد و جماعتیں اگر اس معیار پر عمل کرنے لگیں تو خود اُن کے لیئے زندگی محال نہ ہوجائیگی؟ اگر یہ بدلتے ہوئے "اخلاق و کردار" کسی خاص اُصول و معیار کے مطابق نہیں بن رہے ہیں تو اُن کے بہتر ہونے کی کیا دلیل ہے؟ اور مصالحت کے بعد اُن افعال کو کس طرح جانچا جائے گا؟

حقیقت یہ ہے کہ:-

موجودہ "ترقی پسند ادب" عقلِ نارسا اور دماغ ناپختہ کی پیداوار ہے اور اُس کے جواز کی کوششیں اخلاقی کمزوریوں کو چھپانے کی ناکام کوششیں ہیں۔ یا پھر ایسی طفلانہ ضد ہے جو بچوں کو ماں باپ کی ممانعت کے بعد گندے حوض میں اُتر پڑنے پر آمادہ کرتی ہے۔ میں جناب جوشؔ سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنی فرصت کے چند لمحات اس پر غور کرنے میں صرف کریں، اور ہوسکے تو ان کے دماغوں کا جائزہ لیں واضح ہوجائیگا کہ ایسی کوششیں اپنے جرایم کو پوشیدہ کرنے اور اُس سے زیادہ ان جرایم کو مبنی برحق قرار دینے کی تگ و دو کے سوا کچھ نہیں، جو لوگ کسی وجہ سے برائیوں میں مبتلا ہوگئے ہیں وہ طعنۂ احباب اور خلق کی نفریں سے برافروختہ ہوکر برائیوں کو بھلائیاں ثابت کرنے کی ناجائز مساعی میں مبتلا ہیں، اُن میں سے ایک بھی ایسا نہ ملے گا جسے عام معیارِ انسانیت پر "بھلا آدمی" قرار دیا جاسکے اُن سے مصالحت کرلینے کا خیال بدترین کمزوری ہے، یاد رکھیئے کہ جو قوم اپنے مجرموں کو سزا نہیں دے سکتی اُس میں بڑی سخت اَبتری پیدا ہوجاتی ہے، اور جو حکومت جرایم پیشہ کو سختی کے ساتھ کچل نہیں سکتی وہ تباہ ہوجاتی ہے ضرورت ہے کہ اِس قسم کے غلط کاروں کو پوری قوت کے ساتھ کچل دیا جائے ورنہ پوری سوسائٹی اِس کیفیت میں مبتلا ہوجائے گی جو کسی منظم حکومت کے آخری ایام میں ڈاکوؤں، رہزنوں اور ظالموں کی کثرت سے ملک میں پیدا ہوجاتی ہے۔

(۲) دوسرے اِعتراض کے جواب میں حضرت جوشؔ فرماتے ہیں:-

ہر زندہ اور رو بہ ترقی زبان میں آئے دن تصرفات اور اِضافوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے جس زبان میں اِضافہ و تصرف رُک جائے، سمجھ لینا چاہیئے اَب اُس کی حرکت قلب بند ہونے والی ہے یہ کام اہل بھی کرتے ہیں اور "نااہل" بھی اہلوں کے متعلق تو کچھ کہنا ہی نہیں ہے لیکن ممکن ہے۔ "نااہلوں" کے ناروا تصرفات کے بنڈل سے بھی ایک آدھ چیز کام کی نکل آئے۔ اس کے علاوہ "نااہلوں سے خوف زدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں، اگر وہ حقیقتہً نااہل ہیں تو اُن کی ایک چیز بھی اعلیٰ اَدب کا جزو نہیں بن سکے گی، اور نہ اُنھیں کبھی اِس قدر قبول خاطر و حُسنِ سخن حاصل ہوسکے گا کہ اُن کے ناروا تصرفات زبانوں پر چڑھ جائیں، نااہل ہر دور اور ہر زمانہ میں رہے ہیں، کبھی کبھی اُنھوں نے اپنے گرد و پیش اپنے سے بھی گرے ہوئے نااہلوں کو جمع کرکے جھوٹی شہرت کا طبل بھی بجایا ہے، مگر چار دن چمک دَمک دِکھلا کر ہمیشہ کے لیئے کُمھلا گئے ہیں۔"

یہ صحیح ہے کہ ہر زندہ اور رو بہ ترقی زبان میں آئے دن تصرفات اور اضافوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اور یہ کہنا بھی غلط نہیں کہ جس زبان میں اضافہ و تصرف رُک جائے

سمجھ لینا چاہیئے کہ اب اُس کی حرکتِ قلب بند ہونے والی ہے یہ کام اہل بھی کرتے ہیں اور "نااہل" بھی، لیکن جنابِ مکرم! یہ صحیح نہیں کہ نااہلوں کے ناروا تصرفات کی روک تھام نہ کی جائے اگر ایسی غفلت ہوا کرے تو اَدب و زبان کا بیڑا غرق ہو جائے، ہر زندہ زبان میں نااہلوں کے تصرفات کو چھانٹ کر باہر پھینک دینے کا سلسلہ بھی جاری رہنا ضروری ہے۔ یہ کہنا کہ نااہلوں کے تصرفات کبھی قبولِ خاطر و حسنِ سخن کا مقام حاصل نہ کر سکیں گے، ایک مشہور کلیہ "بقاءِ اصلح" کی غلط تفسیر ہے، واضح رہے کہ فلسفہ کے اِس کلیہ کا مفہوم "بقاءِ احسن" نہیں ہے اور فلسفہ میں بھی یہ چیز مسلّم ہے کہ "بقاءِ اصلح" کا اصول اکثر سخت جان اَبتر کی بقاء کا موجب ہوتا ہے؛

یاد رکھیئے کہ جس باغ میں ناگ پھنی اور کیتلا کو اکھیڑ کر پھینکا نہیں جائے گا، وہاں گلاب و چنبیلی کی جگہ باقی نہیں رہے گی، بلکہ تھوڑے ہی دنوں میں ناگ پھنی اور کیتلا سارے باغ پر چھا جائیں گے۔ وہ کون سی زندہ زبان ہے جہاں ناروا تصرفات کی روک تھام نہیں کی جاتی، کیا آپ کو معلوم نہیں کہ دنیا کی مشہور ترقی یافتہ زبانوں میں مسلّم علماء کی مجالس معیاری لغت کی ترتیب اور معیاری ادب کی تخلیق کا باضابطہ و منظم کام کرتی رہتی ہیں۔ اگر اُردو والوں نے اس کے خلاف آواز اُٹھائی تو کیا جرم کیا؛

(۳) تیسرے اِعتراض "فواحش کی اِشاعت" کے بارے میں جنابِ جوشؔ ارشاد فرماتے ہیں؛

> "یہ اِعتراض اور ہم کریں! یہ بیہوش ہو جانے کی حد تک حیرتناک بات ہے، ہم کہ چشمِ بد دور، فواحش میں پلے، بڑھے اور پروان چڑھے ہیں آج نئے اَدب کے فواحش پر بڑی سنجیدگی کے ساتھ اعتراض کرنے بیٹھے ہیں۔"

اِس کے بعد جنابِ جوشؔ نے فارسی اور اُردو کے چند مشاہیر شعراء کے نام دیئے ہیں اور لکھا ہے کہ یہ لوگ چٹخارے لے لے کر فحش سُناتے رہے، چھپواتے رہے، اور ہمارے آباء و اجداد سے داد و امداد حاصل کرتے رہے، اور ہم اُن کے موروثی مداح نئے اَدب کی فحاشی کا دُکھڑا رو رہے ہیں، پھر فرماتے ہیں؛

> "افسوس کہ اپنے اکابر کے ان اشعار کو درج نہیں کر سکتا جن میں انسان کے جنسی اعضاء کے نام بڑے طنطنے اور طمطراق سے لیئے گئے ہیں۔
>
> لیکن ذیل کے اشعار بھی ماشاء اللہ کچھ کم نہیں ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے اور قدماء کی فحاشی کا اندازہ کیجئے، قبل اس کے کہ میں قدماء کے اَشعار مثال میں پیش کروں، اِس بات کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اِس ناگزیر فریضہ کو بڑے اکراہ کے ساتھ انجام دے رہا ہوں۔ دو ایک بہت عریاں اشعار کو بھی مجبوراً درج کرنا پڑا ہے۔ ہرچند یہ چیز اچھی نہیں ہے۔"

اِس معذرت کے بعد جنابِ جوشؔ نے جامیؔ کی یوسف زلیخا، اور امیرؔ مینائی۔ جان صاحب، میر تقی میرؔ، سید انشاء اللہ خاں انشاءؔ کے دواوین سے چند فحش اَشعار نقل کیئے ہیں۔

اِس جواب پر کسی تنقید و تبصرہ کی ضرورت نہیں خود حضرتِ جوشؔ کی معذرت اِس کی دلیل ہے کہ وہ ان اشعار کی نقل تک کو "بڑے اکراہ" سے برداشت کر رہے ہیں ورنہ ایسے اشعار لکھنا اور اس کا نقل کرنا اُن کے نزدیک بھی اچھی بات نہیں۔

ابھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ کسی فعل کا مدتِ دراز سے جاری رہنا یا قدماء میں اس کا وجود خود اپنی جگہ پر اس فعل کے جواز یا اِستحسان کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ دنیا کے کسی صاحبِ عقل کے نزدیک ایسی دلیل قابلِ قبول نہیں ہوتی؛ اِس لیئے قدیم شعراء و اُدباء کے کلام سے فحش اشعار کا اِنتخاب نئے اَدب کی فحاشی کو مبنی برحق قرار دینے کے لیئے کارآمد نہیں، خود جنابِ جوشؔ بھی اُس کو کوئی "اچھی" بات نہیں سمجھتے، اگر کسی شاعر کے ہزاروں اشعار میں سے دو چار شعر معیارِ اَخلاق سے

گرے ہوئے نقال کر پیش کر دیئے جائیں تو اُس سے صرف ان کی کمزوری یا عدم احتیاط کا ثبوت مل سکتا ہے، یہ نہ ثابت ہو سکے گا کہ نئے ادب کی طرح وہ فحش نگاری کو رواج دینے میں منہمک رہتے۔

دوسروں پر قدامت پسندی کا الزام دینے والے جناب جوش نے اِس قسم کی دلیل دے کر "قدامت پسندی" کے جرم کا ارتکاب کیوں کیا اور اس خود ساختہ فریضے کو "بڑے اکراہ" کے ساتھ کیوں ادا کیا۔

اس سلسلہ میں اصل دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں جب اُن قدیم شعراء نے ایسے اشعار لکھے تھے، کیا اُن اشعار کو "نئے ادب" کی طرح فخر و مباہات کا سرمایہ بنا کر پیش کیا گیا تھا اور کیا دوسروں نے انھیں "جنسی رجحانات کی نفسیاتی تحلیل" کے مغز اور پُرشکوہ علمی نام سے موسوم کیا تھا اگر یہ نہ ہوا تھا اور غالباً اس کے جناب جوش خود بھی معترف ہیں تو انھیں اعلان فواحش نہیں کیا جا سکتا۔

جناب جوش نے اِس سلسلہ میں حضرت امیرالمومنین علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ایک قول بھی پیش فرمایا ہے، فرماتے ہیں:

"اسلام کے سب سے بڑے حکیم جناب امیر علیہ السلام کا قول ہے کہ "بے جا حیا محرومی کا باعث ہوتی ہے" اور نئے ادیبوں کی لے دے کر صرف یہی ایک خطا ہے کہ وہ اس بے جا حیا کا پردا چاک کرتے اور اپنے پڑھنے والوں اور پڑھنے والیوں کو اس محرومی سے محفوظ رکھنے کی سعی کرتے ہیں اور بس۔"

جناب امیرؑ کا ایک دوسرا حکیمانہ قول بھی سُن لیجئے، ایک ایسے ہی استدلال کے موقع پر سرکارؑ نے فرمایا تھا **کلمۃ الحق اُرید بھا الباطل** " (ایک حق کلمہ جس سے باطل مراد لیا گیا ہے) حضرت کے قول سے جناب جوش نے بھی یہی کام لیا ہے۔ جناب جوش کو معلوم ہونا چاہیئے کہ حدیث و آثر کے کسی ٹکڑے سے استدلال اس وقت تک صحیح نہیں ہوتا جب تک ان حالات کو سامنے نہ رکھا جائے جن میں یہ ارشاد ہوا ہو۔ ماشاء اللہ جوش صاحب شارح کلام امیرؑ کا مرتبہ حاصل فرمانا چاہتے ہیں اور مطالعہ کی زحمت گوارا نہیں فرماتے، کیا خدا نخواستہ حضرت امیرؑ کے حضور میں بھی کبھی "انسان کے جنسی رجحانات کی نفسیاتی تحلیل" کی گئی تھی، اور حضرت امیرؑ نے اس پر یہ حکیمانہ ارشاد فرمایا تھا؟ —— اللہ رے جُرأت! دعوے کے ثبوت میں کس کس کو پیش کیا گیا ہے۔ اَب تک تو بیچارے مولویوں پر بزرگوں کے اقوال اور آثار صحابہ سے اپنے موافق مرام مطالب نکالنے کا الزام تھا۔ وہ بیچارے تو ادب و احترام کے جذبات رکھتے ہوئے شاید ایسی جرأت کبھی نہ کر سکتے۔

جناب جوش کو معلوم ہونا چاہیئے کہ حضرت امیرؑ کا قول اِس حیا کے متعلق جو طہارت کے احکام شرعی دریافت کرنے میں حائل ہو۔ یا زیادہ سے زیادہ طبیب کے سامنے امراض کے بیان کو اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ فحش گوئی و فحش نگاری اور نئے ادب کی "نفسیاتی تحلیل" کو اس قول کے ماتحت جائز کرنے کی کوشش کسی طرح جائز کوشش نہیں ہو سکتی۔

اِس سلسلہ میں جناب جوش کا یہ الزام کہ:-

"ہمارے اسلاف کا یہ قاعدہ تھا کہ وہ بچوں کو بسم اللہ کے گنبد میں پالا کرتے تھے جہاں زندگی اور زندگی کے تجربات کی ہوا اور دھوپ کا گزر نہیں ہونے پاتا تھا۔"

صحیح نہیں ہے، ہمارے اسلاف اپنے بچوں کو زندگی کے تمام نشیب و فراز سے باخبر کرتے تھے مگر سنجیدگی و متانت کے ساتھ اس میں تشویق و تمسخر کا پہلو نہ ہوتا تھا جو نئے ادب کی جان ہے یہی وجہ تھی کہ اس کا اثر بچوں کے اخلاق و کردار کی بہتر تعمیر میں کام آتا تھا اور گمراہی و آوارگی شاذ و نادر ہی کبھی پیدا ہوتی تھی۔ آج بھی جو گھرانے شرفاء کے گھرانے کہلاتے ہیں اور جہاں اسلامی و مشرقی اخلاق و آداب کی کارفرمائی ہے وہاں نوجوانوں کو سب کچھ معلوم ہونے کے ساتھ ساتھ حیا کی چادر

سروں سے نہیں اُتاری گئی ہے۔ وہ برائیوں کو جانتے ہیں
مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ برائی ہے، حیا مانع ہے
ورنہ اگر آپ کی طرح شرم و حیا کو وہ بھی دور پھینکدیں تو آپ سے
زیادہ اچھی طرح "انسان کے جنسی رجحانات کی نفسیاتی تحلیل"
کرسکتے ہیں۔ اطباء اور ڈاکٹر کے بارے میں تو آپ کو بھی یقین
ہے کہ تشریح اعضاء اور اُن کے افعال سے اچھی طرح واقف
ہوتے ہیں۔ اور یقیناً ہر طبی درسگاہ میں اعضاء اور اُن کے
افعال و عوارض پر پوری طرح بحث کی جاتی ہے، لیکن کیا آپ
نے کسی سنجیدہ حکیم یا ڈاکٹر کو دیکھا ہے کہ اپنی ان معلومات کو
دوستوں کی محفلوں اور ادبی رسالوں کے صفحات میں بیان
کرتا پھرے؟

"نفسیاتی تحلیل" کا پرشکوہ علمی نام دینے سے کام
نہیں چل سکتا۔ جناب جوش اور اُن کے اعوان و انصار سب
مل کر ان حواس باختہ "جدید ترقی پسند" ادیبوں میں سے
دو چار کے نام تو بتائیں جو کم از کم مبادی نفسیات سے واقف
ہوں اور جن کی تحریروں میں واقعتہً "انسان کے جنسی
رجحانات کی نفسیاتی تحلیل" کی گئی ہو۔

(۴) چوتھے اعتراض "بلینک ورس" کے متعلق
اول تو جناب جوش نے تنبیہ فرمائی ہے کہ ہر نئی چیز پر تلملا اٹھنا
کوئی اچھی ذہنی علامت نہیں، اس کے بعد یہ تسلیم کیا ہے
یہ شاعری ہنوز کھردری ہے بے جوڑ غیر مترنم اور ژولیدہ و
پیچیدہ ہے، اور یہ امید ظاہر فرمائی ہے کہ رفتہ رفتہ اُس میں حسن
اور چکناپن پیدا ہو جائے گا۔ اس کے بارے میں مجھے کچھ
کہنا نہیں ہے، آئندہ کیا ہوگا اور موجودہ کیا ہے اسے حضرت
جوش جانیں اور ترقی پسند شعراء، مجھے تو یہ شاعری حضرت
جوش ہی کی زبان میں کھردری، بے جوڑ، غیر مترنم اور
ژولیدہ و پیچیدہ معلوم ہوتی ہے۔ مجھے کسی نئی چیز کے خلاف
صرف نئی ہونے کی بنا پر کوئی شکایت نہیں۔ اردو زبان
میں ہندی کے گیت بھی چلتے ہیں اور فارسی و عربی بحروں
میں کہے ہوئے شعر بھی، اور اچھے بھی معلوم ہوتے ہیں، لیکن
اس "بلینک ورس" میں گیت اور شعر کی سی کیفیت نہیں
پائی جاتی۔

اس سلسلہ میں حضرت جوش نے ایک دوسرا عذر بھی
پیش فرمایا ہے، کہتے ہیں:-

> اس کے علاوہ دوسرے نقطہ نظر سے دیکھا جائے
> تو ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ آج کل کا نوجوان
> مجبور اور سخت مجبور ہے کہ وہ بلینک ورس ہی کو
> اپنے افکار کے اظہار کا آلہ بنائے۔ یہ خطا نوجوان
> کی نہیں، اُس کے آباء اور اصول تعلیم کی ہے
> کہ وہ اپنی مادری زبان پر قدرت نہیں رکھتا،
> اور فارسی سے قطعی بیگانہ ہوتا ہے جس کے
> بغیر اردو زبان آہی نہیں سکتی۔"
> اس ناواقفیت اور عدم قدرت کے بعد ظاہر
> ہے کہ اس کے واسطے بلینک ورس کے سوا اور
> کوئی دوسری صنف سخن ہے ہی نہیں جسے وہ
> اختیار کرے۔

میں اس عذر میں حضرت جوش سے متفق ہوں، لیکن اس قدر
اضافہ کے ساتھ کہ:-

> "اور شعر کہنا اس قدر ضروری امر ہے کہ جس کے
> بغیر نہ کوئی نوجوان زندہ رہ سکتا ہے اور نہ اسکی
> قوم کبھی ترقی کر سکتی ہے۔"

کیا پیارا عذر ہے ماشاء اللہ جب زبان پر قدرت نہیں تو
آخر شعر کہنا ہی کیا ضروری ہے۔ اب تک کے قادر الکلام شاعروں
نے ہی تعمیر قوم اور تجدید افکار کا کون سا کارنامہ انجام دیا ہے
جو آئندہ یہ نوجوان انجام دیں گے، آخر آپ جو کچھ فرمانا
چاہیں اسے نثر ہی میں کیوں نہ فرمائیں، شعر میں دنیا کو
کوئی پیام دنیا ان کے لئے چھوڑ دیں جو زبان پر قدرت
رکھتے ہیں۔ یہ کیا جنون ہے کہ ہر شخص شاعر بننا چاہتا ہے
دنیا کی کسی زبان میں شاعروں کی ایسی بہتات نہیں جیسی کہ
اردو میں ہے۔ اُن میں مزید اضافہ کی بظاہر کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی

(۵) پانچویں اعتراض کہ "نیا ادب خدا اور مذہب کی توہین کرکے دل آزاری کا ارتکاب کرتا ہے" کا جواب دیتے ہوئے جناب جوش نے اپنے جواب کو چار حصوں میں تقسیم کردیا ہے، فرماتے ہیں۔

(الف) "ترقی پسند ادب مردانہ وار اس کا اقرار کرتا ہے کہ وہ معروف "خدا" اور مذہب کے باب میں عام رائے سے بالکل مختلف رائے رکھتا ہے لیکن جہاں تک توہین اور دل آزاری کا تعلق ہے اس سے اپنی شدید بے تعلقی و بیزاری کا اعلان کرتا ہے۔ صدق دل سے اور بہ بانگِ دُہل اعلان کرتا ہے"

اس اعلان و اظہار کے بعد جناب جوش نے یہ عذر پیش کیا ہے کہ ترقی پسند ادب دنیا میں رشد و ہدایت کے مقدس فرائض انجام دینا چاہتا ہے اور وہی خدمت انجام دے رہا ہے جو انبیاء نے انجام دی تھی، اس سے خود بخود ان حضرات کی دل آزاری ہوجاتی ہے جو تحقیق و تفکر کی جانب میلان نہیں رکھتے ہیں۔

اس جگہ حضرت جوش بے ادبی اور گستاخی کے حدود طے فرما کر ایک تشبیہ دیتے ہیں، سنیئے اور سر دھنیئے، فرماتے ہیں:

"آج سے تیرہ سو برس پیشتر جب اس کرۂ ارض کے ایک سب سے بڑے انسان نے، ایک ایسے افوق البشر انسان نے ایسے عظیم و جلیل و اکمل انسان نے جس سے بہتر انسان پر یہ آفتاب آج تک طالع نہیں ہوا ہے، فاران کی پُراسرار چوٹیوں پر لات و ہبل کے خلاف آوازۂ حق بلند کیا تھا، اس وقت اہل عرب کی بھی دل آزاری ہوئی تھی، لیکن کس کی مجال ہے اور کس کے ذہن میں کمینگی اور رذالت کی اتنی بے پایاں مقدار ہے کہ وہ یہ کہہ سکے فاران کے اس آواز کے پس پردہ دل آزاری کی نیت کارفرما تھی ———— اس لئے کہ ایسی ناگزیر و لاعلاج دل آزاری سے کسی مصلح کی ذات پر کوئی آنچ نہیں آسکتی جو اس کے ارادہ اور اس کی نیت کے بغیر خود بخود معرض وجود میں آجاتی ہے"

ابھی تک جناب جوش "اخلاق و کردار" "زبان میں بیجا تصرف" "فواحش کی اشاعت" اور "بلیننگ و رس کی ترویج" کے سلسلہ میں ترقی پسند ادب پر وارد ہونے والے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے "ترقی پسند ادب" کے جواز پر مصر تھے اور مشورہ دے رہے تھے کہ "ترقی پسند ادب" سے مصالحت کرلی جائے، لیکن خدا اور مذہب کے معاملہ میں حضرت نے اپنا جوش دکھایا کہ اس ملعون و مردود ادب کے وجوب پر دلیل دینے لگے۔ اور پیغمبری کے کارناموں سے لے جا ملایا۔ نعوذ باللہ دماغی الجھن اور بحران کی عجیب و غریب مثال ہے۔ یہ نام نہاد "ترقی پسند" تو اب تک یہی کہہ رہے ہیں کہ خدا اور مذہب کے سلسلہ میں ہم پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ صحیح نہیں لیکن جناب جوش کی وکالت نے تو "بہ بانگ دہل" اعلان کردیا کہ یہ الزام انھیں قبول ہے۔

جناب جوش بدرستگی ہوش و حواس اور بہ ثباتِ عقل و تمیز غور فرمائیں کہ خدا سے انکار یا اقرار کا سوال درمیان میں نہیں ہے، کیا کسی مصلح نے اصلاح قوم کے سلسلہ میں "فواحش کی اشاعت" حیا کی رسوائی اور "انسان کے جنسی رجحانات کی نفسیاتی تحلیل" سے کام لیا ہے؟ خدا کی پناہ!

کیا آپ کو معلوم ہے کہ فاران کی پُراسرار چوٹیوں پر لات و ہبل کے خلاف آوازۂ حق بلند کرنے والے بزرگ و برتر انسان نے انسانی "اخلاق و کردار" کا ایک معیار قول و عمل کے ذریعہ قائم کیا ہے اور اس معیار سے گرنے والے کو انسانی اجتماع کے لئے سفر اور بعض مواقع پر تو ایسے انسان کے لئے بڑی سے بڑی سزائیں مقرر فرمائی ہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اسی بزرگ و برتر انسان نے حیا کو ایمان کا ایک شعبہ قرار دیا ہے اور ایمان کو انسان کے لئے اولین معیار انسانیت فرمایا ہے، بلکہ یہ بھی فرمایا ہے کہ "منکر" کو ہاتھ سے درست کردینا چاہئے،

یا زبان سے اُس کو بُرا کہنا چاہیئے اور کم از کم دل سے بُرا سمجھنا تو ادنیٰ درجۂ ایمان ہے، اِس سے کمتر درجۂ ایمان کوئی نہیں —— اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ایمان کے بغیر کسی عمل کی کوئی قیمت باقی نہیں رہتی۔

کسی معقول آدمی کے ذہن میں "کمینگی و رذالت کی اتنی بے پایاں مقدار" موجود نہیں جو فاران سے بلند ہونے والے آوازۂ حق اور موجودہ نام نہاد ترقی پسندوں کے خروش نامحمود کے ابین کوئی وجہ تشبیہ پا سکے۔

(ب) مندرجہ بالا عجیب وغریب اور نہایت گستاخ قسم کی تشبیہ دینے کے بعد جناب جوش نے ترقی پسندوں کی طرف سے اِس طرح نمائندگی فرمائی ہے، فرماتے ہیں۔

"اب رہی یہ بات کہ نیا ادب "خدا" کے متعلق مختلف رائے کیوں رکھتا ہے؟۔

"سو یہ کوئی ایسی سیدھی سادی اور سہل چیز نہیں ہے جسے کسی ایک مضمون میں بیان کیا جا سکے۔ اِس کے واسطے تو ضخیم دفتر کی ضرورت ہے"۔

اِس کے بعد فرماتے ہیں کہ جب ہندوستان آزاد ہو جائے گا اس وقت چالیس پچاس سال کی کوششوں کے بعد تعلیم و تدریس اور ضخیم کتابوں کی اشاعت کے ذریعہ ابنائے وطن پر واضح کیا جائے گا کہ "ترقی پسند منکرین" کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ خیر! جب واضح کیا جائے گا اُس وقت اس سے بحث بھی کی جائے گی —— اس وقت جناب جوش اس پر بحث کرنا نہیں چاہتے اور میری رائے میں جوش صاحب اِس پر بحث کرنے کے لئے کافی مطالعہ اور عمیق فکر کے محتاج ہیں۔ وہ جن یوروپی مصنفین کے خیالات سے متاثر ہیں، اُن کے خیالات اب پارینہ اور فرسودہ خیالات قرار پا چکے ہیں۔ تجربی علوم اور فلسفہ کی حالیہ ترقیوں نے کسی صحیح العقل کے لئے "مذہب کے معروف خدا" سے انکار کا اب کوئی اِمکان باقی نہیں رکھا ہے۔ حضرت جوش ادب اور شاعری سے کنارہ کش ہو کر اگر اِس موضوع پر تفصیلی مطالعہ کرنا چاہیں تو اعلان فرما دیں، اُنھیں مفید اور کارآمد مشورے دیئے جا سکتے ہیں۔

حضرت جوش نے ماہر القادری کے بعض اعمال کی طرف اشارے کئے ہیں، اور یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ خدا کا اقرار کرنے والے بھی اپنے اعمال کی خرابیوں کی وجہ سے درحقیقت "منکران اقراری" ہیں۔ اِس کا جواب کیا دیا جائے، ماہر القادری اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہیں —— رہا یہ اُصولی مسئلہ کہ عمل اور ایمان دو الگ چیزیں ہیں جن میں سے ایک کا وجود دوسرے کا مستلزم نہیں، عمل کی کمزوریوں کے باوجود ایمان قایم رہتا ہے، ایک ہزار سال سے بارہا ثابت کیا جا چکا ہے اور ساری دُنیا کے اہل دانش کا مسلمہ مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ اِس قدر نظری بھی نہیں کہ اسے بار بار براہین سے ثابت کیا جائے۔ ہر صاحب فکر بغیر کسی منطقی دلیل کے اس مسئلہ پر غور کر سکتا اور اچھی طرح سمجھ سکتا ہے، اقرار اور یقین عمل کے بغیر بھی پایا جاتا ہے بلکہ کمل ہو جاتا ہے لیکن عمل بغیر یقین و اقرار، وجود میں آنے کے باوجود قابل قبول نہیں رہتا۔ دنیا کی ہر سلطنت کے قوانین ہر سماج کے ضوابط اور ہر مذہب کے احکام اِسی اُصول مسلمہ پر مرتب ہیں۔ اور کون نہیں جانتا کہ چوری کا مجرم عمل میں خطاکار ہونے کے باوجود حکومت کے وجود سے اِنکار کرنے والے باغی کی طرح سزائے موت کا مستوجب نہیں سمجھا جاتا۔ افسوس کہ اِتنی صاف و سیدھی سی بات حضرت جوش کی سمجھ میں نہ آسکی۔ آپ نے اِس جگہ قرآن کریم کی آیۃ کریمہ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ سے بھی استدلال فرمایا ہے، دلیل اِس طرح قایم کی گئی ہے کہ:۔

(۱) خدا نے اِس آیت میں وعدہ فرمایا ہے کہ "اگر وہ (مسلمان) خلوص کے ساتھ ایمان وعمل صالح پر قایم رہیں گے تو اِس دنیا کی سرداری اُنھیں کے لئے ہے"۔

(۲) "لیکن آج معاملہ اِس کے برعکس ہے"!

مسلمانوں کی پستی و زبوں حالی کی اس وقت انتہا نہیں ہے"۔

(۳) اس لیئے "اگر خدا کا وعدہ "اعلون" سچا ہے تو ترقی پسندوں پر اعتراض کرنے والے مدعیانِ اسلام کا ادعائے اسلام جھوٹا ہے"۔

(۴) اور اگر معترضین کا ادعائے اسلام سچا ہے تو نعوذ باللہ خدا کا وعدہ اعلون جھوٹا ہے"۔

اور ظاہر ہے کہ معترضین خدا کے وعدہ کو جھوٹا قرار دینے کی جرأت نہیں کر سکتے لہذا خود ان کا ادعائے اسلام جھوٹا ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ حضرت جوش نے منطق کی کوئی ابتدائی کتاب بھی شاید نہیں دیکھی ورنہ استخراج نتایج کی سب سے آسان شکل میں غلطی نہ کرتے، آیئے میں اس آیت کے پورے بیان کو نقل کر کے بتاؤں کہ حضرت جوش کا استدلال کس قدر پوچ اور لچر قسم کا ہے۔

(۱) یہ آیۂ کریمہ غزوۂ اُحد کے بعد نازل ہوئی تھی بیان یہ ہے:۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ آل عمران ع

ترجمہ:۔ و آنانکہ چون می کنند کار ناشایستہ یا ستم کنند بر نفسہائے خود، یاد می کنند خدائے را پس آمرزش طلبند برائے گناہاں خود و کیست کہ بیامرزد گناہاں را مگر اللہ، و نہ باشند ہمیشہ بر آنچہ کردند و اینہا می دانند، آن گروہ جزائے اینہا آمرزش است از پروردگار اینہا و بوستانہا کہ میرود زیر آن جوئہا، جاوید باشند دران، و نیکو مزدیست عمل کنندگان را، بتحقیق درگزشتہ است پیش از شما واقعہا، پس سیر کنید در زمین پس بہ بینید کہ چگونہ بودہ است آخر کار دروغگویان، این کلام بیان است برائے مردمان و راہ نمودن و پندیست مر پرہیزگاران را، و نہ سست شوید و نہ اندوہ خورید و حالانکہ شما برترانید اگر ہستید گرویدگاں، اگر برسد بہ شما زخمے پس بدرستیکہ رسید گروہ کافراں را زخمے مانند این، و این روزہا بیگردانیم آن را میان مردماں، و برائے آنکہ بہ بیند خدائے صبہ آناں را کہ گرویدند و فرا گیرد از شما گواہان و خدا دوست نمی دارد ستمگاران را۔

(ترجمۂ سعدی)

اگرچہ یہ سلسلۂ بیان ابھی اور چند آیتوں تک جاتا ہے مگر فہم کے لئے اِس قدر بھی کافی ہے، غور کیجئے واضح ہو جائیگا۔

تمام مفسرین متفق ہیں کہ اُحد کی شکست سے مسلمانوں پر جب یاس سا طاری ہونے لگا اُس وقت یہ آیتیں نازل ہوئی تھی، اور خبر دی گئی تھی کہ اُس وقت کی شکست سے تم کو سست و مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ اگر تم ایمان والے ہو تو آخر کار تم ہی غالب رہو گے، یہ خبر تھی تو فتح مکہ سے پوری ہو گئی،

اور وعدہ تھا تو مسلمانوں کے قریش پر استیلاء سے وفا ہو گیا۔
یہ صحیح ہے کہ خدا نے آخر کار دنیا پر غالب آنے کا
ہم سے وعدہ کیا ہے، لیکن یہ قاعدہ بھی یاد رہے کہ بعض اعمال
وعمل کی بنا پر تِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ
کے اصول مقررہ کے مطابق ایسے زمانے بھی آتے رہتے ہیں
جب کہ مسلمانوں پر دوسری قوم غالب آجاتی ہے۔ اس سے
یہ استدلال کرنا کہ ایسے وقت میں مسلمان، صاحب ایمان
نہیں رہتے اعلیٰ درجہ کی کج فہمی ہے، مذکورہ بالا آیتیں جب
نازل ہوئی تھیں خود اسی وقت مسلمان شکست خوردہ تھے
اور کہیں ان کی حکومت نہ تھی، باوجودیکہ علی مرتضیٰ وعمر فاروق
ان میں موجود تھے بلکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان میں
تشریف فرما تھے۔

حضرت جوش جنھوں نے اس مشہور آیت کا حوالہ
دینے کو غالباً پہلی مرتبہ قرآن مجید کھولا تھا واقف نہیں ہیں
کہ حق کا کسی وقت بڑی سے بڑی مدت کے لئے مغلوب ہو جانا
ناحق کے مبنی برحق ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ انھیں معلوم
ہونا چاہیئے کہ خدا کا وعدہ بھی سچا ہے اور ہمارا دعائے اسلام
بھی۔ ہم میں بعض افراد کی عملی خامیاں یا اکثر افراد میں
بعض خامیاں متاع ایمان کو یقیناً ہم سے دور کر دیتی
ہیں لیکن ہمیں ایمان واسلام سے خارج نہیں قرار دیتی
ہیں ــ بعض افراد یا کسی خاص طبقہ کے اعمال پر کھلے بندوں
بحث کرنا اچھا نہیں۔ میں حضرت جوش سے صرف اتنا
کہہ سکتا ہوں کہ،

شیشہ کا گھر بنا کر اوروں پہ پھینکیں پتھر
کیسے ہیں بھولے بھالے ایسے مکان والے

(ج) اس اعتراض کا ایک تیسرا جواب دیتے ہوئے
حضرت جوش فرماتے ہیں:-

"اس کے علاوہ تحقیقی اور اصلی خدا کا نہ تو
معترضوں کو ہی پتہ ہے اور نہ آدمیوں کو، دونوں
اس باب میں بے پایاں تاریکی اور نہایت
جہالت میں مبتلا ہیں، البتہ رسالت کے بتائے
ہوئے ایک کتابی خدا کا انھیں بھی پتہ ہے اور
انھیں بھی۔ لیکن اس کتابی خدا کا جو تخیل پیش
کیا گیا ہے، ہر چند اس میں اطلاق وتنزیہہ کا
عنصر بھی شامل ہے لیکن جب اس کے صفات
کے تمام اعداد کو جوڑ کر میزان کل دی جاتی ہے تو
وہ ایک ایسا شخصی خدا برآمد ہوتا ہے جو قطعی
طور پر غیر عاقلانہ، غیر حکیمانہ اور غیر سائنٹفک ہے
اور معیاری "الوہی وسعت" "الوہی حکمت"
"الوہی معدلت وبصیرت" اور "الوہی تمجید" کے
معیار پر نہیں اترتا ہے۔ اور اسی بنا پر
ترقی پسندوں کا یہ خیال ہے کہ اگر خدا کا وجود
اس کائنات کی شرط لازمی ہے تو اس دنیا کا
خدا ہرگز اتنا چھوٹا نہیں ہو سکتا، جتنا چھوٹا
خدا اہل مذاہب نے پیش کیا ہے۔"

اس تحریر سے حسب ذیل تنقیحات قایم ہوتی ہیں۔

(۱) تحقیقی اور اصلی خدا اکیلا ہے۔
(۲) رسالت کا بتایا ہوا خدا کیا اصلی خدا نہیں ہے؟
(۳) رسالت کا بتایا ہوا خدا کیا واقعتہً غیر عاقلانہ غیر حکیمانہ اور غیر سائنٹفک ہے؟
(۴) یہ "معیاری الوہیت" کیا ہے جس پر رسالت کے بتائے ہوئے خدا کو جانچا جا رہا ہے؟
(۵) یہ معیار الوہیت کس نے قایم کیا اور کس دلیل سے اسے مسلمہ معیار سمجھا جائے؟
(۶) مذہب کا پیش کیا ہوا خدا کیا واقعتہً چھوٹا ہے۔

ان چھ سوالات کے جوابات دینے سے پہلے ایک
بات ذہن نشین کرا دینا ضروری ہے کہ دنیا کے دقیق علمی
مسائل پر بحث کرنے کی تمنا کسی عالم وفاضل شخص سے زیادہ
ایسے جاہل افراد میں پیدا ہوتی ہے جو دو چار صحبتوں میں بیٹھ کر
چند باتیں سن لیا کرتے ہیں اور غلط فہمی سے یہ سمجھنے لگتے ہیں

وہ بزعم خود علامۃ الدہر بن گئے ہیں۔

اِس جگہ عموماً ایک بات کہی جاتی ہے اور وہ یہ کہ جب تک کوئی بات عقل میں نہ آئے کس طرح مان لی جائے اگر اہل مذہب ہر عامی وجاہل کے سامنے خدا کا ایسا تصور نہ پیش کر سکیں جو اُس کی عقل کے مطابق ہو تو ایک عامی شخص خدا کے وجود پر ایمان لانے کے لیئے مکلف نہیں ہو سکتا۔

اگرچہ یہ دلیل اَب بیسویں صدی کے وسط میں ایک پامال عقلیت اور فرسودہ خیال سے زیادہ کچھ نہیں لیکن ہر جاہل اِسی دلیل کی آڑ لیتا ہے —— ذرا غور سے دیکھیئے۔ دُنیا کے کتنے معاملات اور کتنی حقیقتیں ہمارے یقین کے اجزاء ہیں مگر اُن میں سے ایک بھی عقلی دلیل اور تجربی براہان سے ثابت نہیں کئے جا سکتے۔

یاد رکھیئے کہ اِنسانی عقاید عقلی دلیل پر قایم نہیں ہیں۔ بلکہ اِنسان کا قلب جس اَمر کو قبول کرتا ہے اُس پر یقین پیدا ہوتا ہے اور یقین کے ماتحت عمل شروع ہو جاتا ہے یہ ایک فریب نفس ہے کہ عقلیت سے دُنیا کا کوئی کام چل سکتا ہے۔

(۱) و (۲) تحقیقی اور اصلی خدا اور رسالت کے بتائے خدا میں کوئی فرق نہیں ہے۔ رہا یہ سوال کہ اس کا پتہ کسی کو نہیں یہ بھی صحیح نہیں اُس کا لوگوں کو پتہ ہے البتہ وہ حواس کے ذریعہ حاصل ہونے والے علوم کی دسترس سے باہر ہے' اُسے جدید فلسفہ بھی تسلیم کرتا ہے اور قدیم بھی؛

(۳) صفات کے بغیر خدا کا تصور جدید فلسفہ اور سائنس کے نزدیک نامعقولیت ہے۔ رسالت کا بتایا ہوا خدا غیر عاقلانہ اور غیر حکیمانہ نہیں' عقل حضرت جوش جیسوں کی سند نہیں ہو سکتی؛

(۴) "معیاری الوہیت" یہ معیار آپ کی عقل نارسا کی پیداوار ہے جو خالص حکمت کے سامنے بے اصل ٹھہرتی ہے آپ کی عقل کو حقایق کی دریافت اور اُن کی تنقیح میں معیار نہیں قرار دیا جا سکتا۔

(۵) بے دلیل اور مہمل باتیں ہیں' جب آپ کے پاس ہماری طرح دس حواس ظاہر و باطن کے علاوہ کوئی اور ذریعہ علم نہیں تو کیوں آپ کی بات سند مستند قرار پائے۔

(۶) اطلاق و تنزیہہ کو دیکھتے ہوئے کوئی عقلمند مذہب کے تصور خدا کو تنگ اور چھوٹا نہیں کہہ سکتا؛

حضرت جوش نے یہ مشورہ دیا ہے کہ ایک ادارہ عقلیت کے ماتحت خدا کے وجود پر اعتراضات کے جوابات کے لیئے قایم کیا جائے۔ یہ ایک نہایت فضول حرکت ہوگی خدا عقلی دلیلوں سے نہیں بلکہ حقیقی تلاش سے معلوم کیا جاتا ہے۔

اگر کسی ہسپتال میں عامی و جاہل آدمی جا کر دوا اور علاج کے متعلق طرح طرح کے اعتراض کرنے لگے تو ڈاکٹروں کا فرض اُس کو سمجھانا نہیں بلکہ اُسے نکال دینا ہوگا۔ فنی اُمور میں اِس قسم کے جاہلانہ اعتراضات کا جواب نہیں دیا جاتا۔ یہ فن ہے اِس میں کچھ دن رہ کر سیکھنا اور سمجھنا پڑتا ہے۔

(۷) جوش صاحب نے ایک بات یہ بھی کہی ہے کہ اَب تک تمام مسلمان شعراء نے ایسی باتیں کہی ہیں جو اِسلام کے خلاف ہیں۔ اور آخر میں یہ فیصلہ فرمایا ہے کہ قرآن مجید کے حکم کے مطابق شاعروں کی اِتباع گمراہوں کا کام ہے' یہ لوگ ایسی ہی واہیات بکواس کرتے رہتے ہیں۔ اُنھیں اِحتساب سے آزاد چھوڑ دینا چاہیئے۔

میں شاعر نہیں' میں کسی شاعر کا متبع بھی نہیں' یہ احکام جوش صاحب نے اپنے اور اپنے ہم پیشہ شاعروں کے لئے جاری کئے ہیں میں اِس سلسلہ میں کیا عرض کروں؟

البتہ یہ عرض کر دوں کہ جوش صاحب کا یہ اِستدلال کہ "اَب تک ہمیشہ سے یہی ہوتا رہا ہے" اِس لئے اِس کے خلاف کچھ نہ کہو۔ یہ کسی عقلمند کے سامنے صحیح نہیں ہو سکتا۔ دُنیا میں ہزاروں برائیاں ہیں جن کی اِبتداء کے متعلق

کسی کو علم نہیں، اور کوئی نہیں جو اُن کے قدیم الایام سے ہونے یا عام طور پر رائج ہونے سے انکار کرے لیکن اُس سے وہ برائیاں اچھائیاں نہیں ہو جاتی ہیں۔ ستی کی رسم ہندوستان میں اتنی مدت سے جاری تھی کہ اُس کی ابتداء کے متعلق کوئی صحت کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اُس سے ستی کی رسم محمود یا قابل برداشت نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح ظلم و جبر، لوٹ مار، اور چوری بھی ہمیشہ سے ہو رہی ہے لیکن یہ قدامت اُس کو قابل برداشت نہیں بنا سکتی۔

"ترقی پسند ادب" کے متعلق یہ تو الزام بھی نہیں کہ یہ لوگ "خدا" کے منکر ہیں، آج کل ایک اجنبی حکومت کے ماتحت ہر لا مذہب کو سب کچھ اختیار حاصل ہے۔

کہاں ایسی آزادیاں تھیں میسر
انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

لیکن سوال یہ ہے کہ کسی لا مذہب کو ہمارے مذہبی معتقدات پر ہنسنے اور اُس کا مذاق اُڑانے کا کیا حق حاصل ہے اور کیوں نہ ہم اُسے بہ قوت سزا دیں۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہم اپنے مخالفوں سے رواداری کیوں نہیں کرتے، اگر واقعۃً سنجیدگی کے ساتھ کسی کو کچھ سمجھنا ہو تو ہم اُس سے کبھی ناخوش نہ ہوں لیکن آپ ہی انصاف سے فرمائیں کہ جب آپ جیسے لوگ مفسرین بیٹھیں تو ہمارے پاس آپ کو سمجھانے کی کیا صورت رہ جاتی ہے۔ ہر جاہل لونڈے نے جسے اپنی اخلاقی بداعمالیوں کے چھپانے کا کوئی موقع نہیں ملتا یہ طریقہ اختیار کر رکھا ہے کہ جواز و عدم جواز۔ گناہ و ثواب اور بدی و نیکی کی بندشوں سے آزاد ہونے کی غرض سے خدا اور مذہب پر اعتراض کرے۔

اگر شرافت و حق پسندی کا کوئی جذبہ ترقی پسندوں میں موجود ہے تو خود گریبان میں سر ڈال کر دیکھیں کہ اس ایک مقصد کے سوا اُن کی مخالف مذہب تحریروں سے اور بھی کچھ مقصد ہوتا ہے؟

جناب جوش مطمئن رہیں کہ میں اس سلسلہ میں خود اُن کے اعمال پر کوئی احتساب کرنا نہیں چاہتا۔ ادب پر احتساب کا سوال درپیش ہے، ادیب پر نہیں۔

محمود محتسب

محبت اور نفرت کے خالق
ڈاکٹر اختر حسین رائپوری کی معرکۃ الآرا تصنیف

ادب اور انقلاب

انسانی زندگی، اجتماعی و انفرادی دونوں حیثیتوں سے انقلابات کا گہوارہ ہے اور ادب انسانی افکار و خیالات کا مکمل عکس۔ اس عکس کی نقاشی، اور اسکے پورے خط و حال کی تشریح ایک مشکل دقیق اور نازک کام ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائپوری ہماری زبان کے وہ باریک بیں ادیب ہیں جنہیں فطرت فیاض کی طرف سے کمال نظر و کمال بیان دونوں عطا ہوا ہے۔ ان کی تصنیف "ادب اور انقلاب" اس کمال کا نقشہ ہے۔ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ابتک ہماری زبان میں اس موضوع پر دوسری کتاب نہیں لکھی گئی۔ ممکن ہے کہ یہ پہلی کتاب نقش ثانی بلکہ نقش ثالث سے زیادہ مکمل ہے۔ اردو کی اس شاندار کتاب سے آپکی لائبریریوں کو خالی نہ رہنا چاہئے۔ کتابت، طباعت، کاغذ اور دوسری خوبیوں کیلئے ادارہ اشاعت اردو کا نام کافی ہے

قیمت ہے مجلد رنگین گرد پوش

رئیس الاحرار

مقالات محمد علی

حصہ اوّل

محمد علی — ہندوستان کا آتش نوا زعیم جب تک زندہ رہا۔ اپنی شعلہ سامانیوں سے محفل کو لذت سوز نے لطف تپش سے، جلنے اور جلتے رہنے کے کیف سے روشناس کراتا رہا۔

اس نے تقریریں بھی کیں، اور مضامین بھی لکھے۔ اسکی زبان آب رواں کی طرح چلتی تھی۔ اس کا قلم شمشیر خارا شگاف کا کام دیتا تھا۔

محمد علی مرحوم کے سوانح نگار رئیس احمد جعفری نے بڑی عرق ریزی اور دیدہ کاوی سے یہ مجموعہ مرتب کئے ہیں۔ پہلا اور دوسرا مجموعہ پریس میں جا چکا ہے۔ آج ہی اپنا نام درج رجسٹر کرا لیجئے۔ ورنہ ممکن ہے آپکو دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے۔

قیمت اندازاً
تین روپے آٹھ آنے

ادارہ اشاعت اردو۔ عابد روڈ حیدرآباد دکن

علی اختر

دکن کی صبح

اللہ رے دکن کی بہاریں دکن کی صبح — جیسے ہجومِ لالہ و گل میں، چمن کی صبح
شبنم کے موتیوں سے درخشاں سمن کی صبح — یعنی حریفِ عالمِ غربت، وطن کی صبح!

پرچم کھلا ہوا وہ خزاں میں بہار کا!
منظر وہ دیدنی اُفقِ زر نگار کا!

شاخوں پہ گلِ لطافتِ صہبا لئے ہوئے — رندانِ مست، ساغر و مینا لئے ہوئے
ذرّے تمام وسعتِ صحرا لئے ہوئے — غنچے سرور و نور کی دُنیا لئے ہوئے!

موجوں میں خم وہ گیسوئے عنبر سرشت کے!
ہر سو کھلے ہوئے وہ دریچے بہشت کے!!

رنگیں پہاڑیوں پہ وہ کرنوں کا اضطراب — سبزے کی وہ بہار وہ شبنم کی آب و تاب
وہ رنگ و بُو کی موج رواں اور وہ رقصِ آب — وہ ندّیوں کا حُسن وہ بہتی ہوئی شراب!

لہروں کو رشتۂ مہ و پرویں کئے ہوئے!
کرنیں بساطِ خاک کو رنگیں کئے ہوئے!!

جنگل کی دیویوں کے وہ شاداب خد و خال — تیور وہ ہرنیوں کے تو وہ مورنی کی چال
شانوں پہ گاگریں وہ برستے ہوئے جمال — صورت پذیر ہو کے رہی جنتِ خیال!

اِک موجِ نور غنچۂ نورس لئے ہوئے!
دامن میں اپنے صبحِ بنارس لئے ہوئے!!

نیم وا دریچے

احمد ندیم قاسمی

——— ' اُسے دیکھنے والے کہتے "پر یہ وکیل کیسے بنا؟ وکیلوں والی تو کوئی بات نہیں۔ اس میں۔ اِس کی ہر بات رَس بھرا شعر ہے' اِس کی ہر حرکت میں غنودگی ہے' اس کی آنکھوں سے ہمیشہ خواب سے جھانکتے رہتے ہیں۔ اِتنے ہلکے پھلکے مزاج کا نوجوان تعزیرات ہند کے خارزار میں کیسے اُلجھا! بھئی یہ کوئی راز کی بات ہے!"

کہنے والے سچ کہتے تھے۔ وکالت کا پیشہ اِختیار کرنے میں اُسکا ایک راز پوشیدہ تھا۔ جب وہ اپنے دفتر کی گھومنے والی کرسی پر بیٹھ کر اخبار کی آڑ سے سامنے سڑک پر پریشان حال دہقانوں کو اپنی طرف آتا دیکھتا تو اُس کی بصارت اُس کی آنکھوں میں ریت کے موٹے موٹے ذرے بن کی چبھنے لگتی۔ اور اُس کے ہونٹوں پر باریک سی شکنیں اُبھر آتیں جو کچھ دیر کے بعد بھوری پپڑیاں بن جاتیں۔

اُس کا منشی کان پر پنسل رکھے' عینک کو ناک کے مرجھائے ہوئے بانسے پر لٹکائے اندر آتا اور کہتا: "قتل کا کیس ہے محمود صاحب" ——— دفعہ ۳۰۲ کے موٹے موٹے حروف سامنے دیوار پر اُبھر آتے۔ لیکن جب اُسے معلوم ہوتا کہ اِس قتل میں زن کے بجائے زر اور زمین کا ہاتھ ہے' تو وہ اخبار کو مروڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتا اور نیلی روشنائی کے قلم کو لال روشنائی میں ڈبو کر سیاہی چوس پر بے ڈھنگے سے دستخط کرنے لگتا۔

منشی عینک اُٹھا کر ناک کے بانسے کو رگڑتا۔ اور پنسل کو ایک کان سے دوسرے کان پر جماتے ہوئے کہتا: "محمود صاحب۔ اِتنے اچھے کیس لے آتا ہوں میں۔ مگر آپ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ پانسو روپے فیس بھی بچا لی ہے۔ دِن دھاڑے کا قتل ہے صاحب۔ سارا گاؤں دیکھنے والا۔ ملزم موقعہ پر گرفتار۔ کلہاڑا ہاتھ میں۔ کپڑے خون میں تر۔ اور پھر پہلی پیشی پر مجسٹریٹ کے سامنے اِقبالی ہو گیا کمبخت۔ اُس کا باپ تو اپنی ساری پُونجی بیچ کر بھی مقدمہ لڑے گا!"

لیکن محمود کے لیئے روپوں کا لالچ فروعی حیثیت رکھتا تھا اُس کے پاس روپئے پیسے کی کمی نہ تھی۔ اُسے آرزو تھی تو محض زندگی کے ایک خواب کی تعبیر کی ——— ایک دلآویز خواب جو گہرے مطالعے کا نتیجہ تھا۔ اور جس نے اُس کے دنوں پر سائے اور راتوں پر کرنوں کے تارے پھیلا رکھے تھے۔

کتابوں میں اُس نے پڑھا تھا کہ دیہاتی لڑکیوں کے حُسن میں ابھی تک یونانی تصور کی وہ رمق باقی تھی جس نے دیوتاؤں کے دماغ معطل کر دیئے۔ اور زندگی کے کڑے قانون محض اُس حسن کی ہم نشینی کے لیئے توڑ پھوڑ ڈالے گئے۔ وہ شہروں سے بیزار تھا۔ یہاں کی سڑکیں تک بھی تو مصنوعی تھیں۔ کنکریاں بچھاؤ۔ انجن چلاؤ۔ تارکول کا تعفن پھیلاؤ۔ اور مقدس دھرتی کے جسم پر بدنما خراشیں ڈال دو۔ یہ بڑے بڑے ہوٹلوں کے دبیز پردوں کے پیچھے ریڈیو کی مدھم آوازیں۔ گھبرائے ہوئے قہقہے اور پرابرار مکسر پھیر سائنس کے ایجاد کردہ آلات سے سُلجھی ہوئی پلکیں جو دیر تک جھکے رہنے کے جادو سے نا آشنا تھیں۔ یہ گرجتے ہوئے بازار اور یہ بھبکتی ہوئی دکانیں! ——— یہاں زندگی دیوانی ہو رہی تھی!

اور وہاں ——— دیہات میں ———

اُس کے محبوب مصنفین کے قول کے مطابق ——— زندگی ازلی اور ابدی شگفتگی کی جھلکیاں لئے ہوئے تھی۔ وہاں کے

لالہ زاروں کے مالی کا کام خود فطرت نے سنبھال رکھا تھا۔ وہاں کا حسن سادہ اور معصوم تھا۔ وہاں کی معاشرت میں ریشم کا سا لوچ اور نرمی تھی۔ وہاں کی لڑکیاں بے لوث مسکراہٹیں بکھیرنے میں بخل سے کام لیتی تھیں۔ اُن کی جھکی ہوئی پلکوں کی اوٹ میں بے داغ گیتوں کے ہجوم تھے۔ کیونکہ اونچی چوٹیوں پر صنوبروں کے تلے اور نیچے میدانوں میں کیکروں کی چھدری چھاؤں میں اُنھوں نے چرخے کاتے اور دودھ بلوئے تھے۔ فطرت کی ہم نشینی نے اُنھیں سادہ اور پاک بنا دیا تھا۔

طالب علمی کے زمانے سے وہ دیہاتنوں کی اُن پُر اسرار رنگینیوں سے فیض یاب ہونا چاہتا تھا، جن کے تذکرے کرتے ہوئے بڑے بڑے اہل قلم فصاحت کے دریا بہا دیتے تھے، وکالت کا پیشہ اُس نے اسی لیئے اختیار کیا تھا۔ لیکن اُس کے ہاں دیہاتی آئے مگر دیہاتنیں نہ آئیں۔ ایک بار ایک بڑھیا لاٹھی ٹیکتی اُس کے دفتر کے قریب سے گزری۔ وہ اندھی تھی۔ اور اُس کا ہاتھ ایک نوخیز لڑکی نے تھام رکھا تھا۔ جو کسی کی طرف دیکھتے ہوئے جھجکتی تھی اور جھجکتے ہوئے ہر کسی کو دیکھ لیتی تھی۔ اُس کے جی میں آئی۔ کہ بڑھ کر لڑکی سے کہے "چھوکری۔ تو دُکھیا معلوم ہوتی ہے مجھے۔ اگر تجھ پر ظلم ہوا ہے اور تو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہتی ہے تو اِدھر آ۔ میں تیرا کام دام لیئے بِنا کر دوں گا۔ تیرا فرض بس اِتنا ہوگا تو سارا واقعہ مجھے سُنا دے ——— اور پھر مُسکرا دے ——— اور پھر اپنے میلے ڈوپٹے سے اُلجھے ہوئے بال چھپاتے ہوئے مجھے صرف اِتنا کہہ دے " وکیل میاں۔ تو بڑا وہ ہے!"

وہ دروازے تک آیا بھی۔ لیکن اچانک اُسے یُوں محسوس ہوا جیسے وہ ہوا میں لٹک گیا ہے، وہ دونوں بھکارنیں تھیں۔ اور شام کے کھانے کے لیئے ایک آوارہ نوجوان کے آگے ہاتھ پھیلائے کھڑی تھیں " بابو۔ ایک پیسہ رے بلنکے بابو۔ اللہ تیرا سہرا باندھے!"

" اور تو گھونگھٹ نکالے " آوارہ نوجوان پان کی پیک نچلے جبڑے میں سنبھالتے ہوئے بولا " تو ہندی رچائے اور بڑھیا ڈھولک بجائے اِس سنجوگ پر!"

" اللہ مارا " لڑکی بولی۔

" خدائی خوار " بڑھیا بڑبڑائی۔

اور آوارہ نوجوان بیڑی سُلگاتا محمود کے سامنے سے ایک گیت گاتا گزرا ؎

چھوڑو جی۔ بتیاں چھچھوری کرت ہو
ننگے ہو، کیوں جورا جوری کرت ہو
ٹھٹھے میں مَنوا کی چوری کرت ہو
مان بھی جاؤ جی۔ ہٹ نہ دِکھاؤ جی
من کلپت ہے۔ دھیر بندھاؤ جی۔ آؤ جی۔ آؤ جی!

اور اُس نے پھیپھڑوں کے پُورے پھیلاؤ سے کام لے کر ایک بھونڈا کھڑکھڑاتا نعرہ لگایا " آؤ جی!"

قریب کے ایک بالا خانے کی کھڑکی پٹ سے کھلی اور کھٹ سے بند ہو گئی۔ اور ایک باریک سا قہقہہ سنگین دیواروں سے سر ٹکراتا روشندانوں سے کھسک کر محمود کے کانوں کے قریب غضبناک بھڑ کی طرح بھنبھنانے لگا!

اُسی روز اُس نے قریب کے ایک پہاڑی گاؤں میں جانے کا تہیہ کر لیا۔ منشی نے جب یہ سُنا تو اس کی عینک ناک کے بانسے سے لٹک کر بھوری مونچھوں پر اٹک گئی۔ آنکھوں پر پپوٹے جھک آئے۔ بھویں بل کھا گئیں۔ قلم کے اُلٹے سرے کو دوات میں ڈبو کر بولا " اور میں محمود صاحب؟"

" تمہیں ہر مہینے باقاعدہ تنخواہ ملتی رہے گی " محمود بولا۔

اور منشی کی آنکھیں کھل گئیں۔ بھویں تن گئیں اور عینک اُچک کر ناک کے بانسے پر ہو بیٹھی۔ ہونٹ لرزنے لگے جیسے کہ رہا ہو " کسی نیک کام کا پھل ہے یہ۔ ورنہ بنا کام، دام۔ کون دے گا اِس گئے گزرے زمانے میں۔ اور محمود صاحب۔ تم کہیں نکل جاؤ۔ میری بلا سے۔ پر یہاں نقد سودا چلتا ہے۔ تم تنخواہ نہیں دو گے تو پنڈت بلکی رام پلیڈر تو کہیں نہیں گئے۔ جو ایک برس سے تجربہ کار منشی کی تلاش میں ہیں!"

سیدھا سادا شہری لباس پہنے ہاتھ میں چمڑے کا ایک بیگ لٹکائے وہ اسٹیشن پر آیا اور کسی غیر معروف مقام کا ٹکٹ خرید کر

تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں بیٹھ گیا۔

اس ڈبے کے مسافر ہندوستان کے تمام صوبوں کی نمائندگی کر رہے تھے مگر اکثریت اُن دیہاتیوں کی تھی جو محمود کے خوابوں کے درسوں کے بھولے بھالے کردار تھے، اور جن میں ابھی تک اُزل میں بخشی ہوئی زندگی کی دُھندلی سی جھلکیاں پائی جاتی تھیں۔ مسافروں سے گھُل مِل کر بیٹھنے کی تمہید خوش مذاقی ہے۔ یہ مقولہ اُس نے کسی کتاب میں پڑا تھا۔ اِس لئے وہ آس پاس دیکھنے لگا۔ ایک بنگالی کی عینک کے سُنہرے فریم پر ایک مکھی بار بار بیٹھتی تھی۔ اور وہ جھلا کر بار بار اپنا ہاتھ جھٹکتا تھا۔ محمود آگے جھک کر بولا "مکھی آپ کو تنگ کر رہی ہے!"

"ہم" بنگالی نے اُمرت بازار پتر کا میں اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش کی۔

"بِشماس پر بیٹھتی ہے مکھی" محمود بولا۔

"ہم" بنگالی نے اخبار کا زاویہ اور بلند کر لیا۔

"رَس گلے کھائے ہوں گے آپ نے؟" محمود خوش مذاقی پر تُل گیا تھا۔

"ہم ——— ہیں؟" بنگالی بھڑک اُٹھا "رَس گلے؟ اِدرکا رَس گلا اُدر کے رَس گلے کا بچہ ہے۔ اَدرکا رَس گلا یہ ہوتا ہے ——— اور اُس نے پہلو سے سنترہ اُٹھا کر انگلیوں میں گھمایا۔

"اور اِدرکا رَس گلا؟" محمود نے پُوچھا۔

"اِدرکا؟" بنگالی سوچ میں پڑ گیا "اِدرکا رَس گلا ——— اِدرکا بس آپ کی ناک مافق ہوتا ہے!"

آس پاس بیٹھے ہوئے مسافر گو نجیلے قہقہے لگانے لگے، سب کے سب اُس کی اچھی بھلی ناک کو گھورنے لگے، جس میں شرارت بھری نظریں جیسے سُوراخ سے کر رہی تھیں۔

اُس طرف سے ایک دیہاتی طنزاً کھنکارا "آہم" ۔ اور پھر محمود کے قریب آ کر بولا "اِس بُقچی میں کیا ہے میاں؟"

"کیوں؟" محمود سٹپٹا گیا۔

دہقان اپنے ساتھیوں کو گوشۂ چشم سے اِشارہ کرتے ہوئے "یہ بُقچی کھولو نا میاں۔ دَوا دارو کو یوں بغل میں دبائے پھرنا بھلے آدمیوں کی ریت نہیں۔ ایسی بُقچی حکیم ہی تو رکھتے ہیں اپنے پاس"

ایک سرحدی پٹھان آخری اُنگلی میں سگریٹ اٹکا کر اور ایک ہولناک کش لگا کر بولا "یا نائی!"

قریب ہی ایک پُوربیا گڑوی سے چلو پر پانی ڈلتے ہوئے بولا "یا بنجارے!"

پرلی سیٹ پر دبکی ہوئی دیہاتنیں آنچلوں میں ناکیں چھپا کر گنگنے لگیں۔ اور محمود گھبرا کر بولا "بھئی۔ نہ میں حکیم ہوں۔ نہ نائی ہوں۔ نہ بنجارا بسیرے نکلا ہوں گھر سے۔ اِس بیگ میں چند کپڑے اور ایک کیمرہ ہے۔ میں وکیل ہوں"

"وکیل ہیں آپ؟" عقب سے کسی نے محمود کی گردن کو چھُوا۔ محمود نے پلٹ کر دیکھا تو ایک لالہ جی آنکھیں پھاڑے اُسے گھُور رہے تھے "معاف کرنا جی۔ آپ وکیل ہیں نا؟۔ ایک بات پوچھنی ہے آپ سے۔ اگر ایک شخص ایک دوسرے شخص سے قرضہ لے۔ اور رسید لکھ کر نہ دے۔ اور پھر قرضہ چکانے سے اِنکار کر دے تو قرضہ دینے والا شخص کیا کرے؟"

"چلو بھر پانی میں ڈوب مرے!" محمود بیگ سنبھالتے ہوئے بولا۔ اُٹھ کر ایک کونے میں جا بیٹھا اور سوچنے لگا "یہ حقے گڑگڑاتے۔ بیٹھیں کھڑکھڑاتے۔ رہتے قہقہے لگاتے پنجابی دہقان شاید اِن مصنفوں نے نہیں دیکھے۔ جنھیں اِن کے دلوں کے بلور پر کوئی دھبہ نظر نہ آیا۔ مگر ہو سکتا ہے یہ دیہاتی نہ ہوں۔ قصباتی ہوں اور پھر قصبوں میں ریلیں نہ سہی وہ لاریاں تو پہنچ ہی چکی ہیں جن کے عقب میں زندگی کی پاکیزگی چیختی چلاتی گھسٹتی رہ جاتی ہے!"

جوں توں کر کے وقت کٹا۔ اِسٹیشن پہاڑ کے دامن میں تھا۔ پلیٹ فارم سے باہر آیا۔ چند پگڈنڈیاں اِدھر اُدھر بلکتی لچکتی پہاڑوں کی بھوری وسعتوں میں گھُل گئی تھیں۔ گاڑی دھوئیں کی پھیکی پھیکی لکیر چھوڑتی اُفق پر سمٹی جا رہی تھی اور اسٹیشن کے جنگلے کے سِرے پر لکڑی کے تختے کا سہارا لئے ٹکٹ بابو ٹکٹ گِن رہا تھا۔ کسی اپھے سے گاؤں کا پتہ پُوچھنے کے لئے محمود بابو کی

طرف بڑھا۔ بیگ کی چر رچر رسے ٹکٹ بابو چونکا تو محمود بولا "بابوجی معاف کیجئے گا۔ آپ مصروف تھے۔ مجھے کسی ایسے گاؤں کی راہ بتائیے جو نزدیک بھی ہو، اچھی جگہ پر بھی ہو۔ گاؤں کی ساری خصوصیات بھی موجود ہوں۔ میں اجنبی ہوں۔ سیر پہ نکلا ہوں گھر سے۔ اور پھر مجھے کسی خاص گاؤں میں تو جانا نہیں۔ بس کوئی اچھا سا پیارا سا گاؤں ہو!"

بابو گھوم کر محمود کے قریب آگیا۔ بولا "مجھے آپ کی بات سمجھ نہیں آئی!"

محمود مسکرایا "بات یہ ہے بابوجی۔ کہ میں سیر پہ نکلا ہوں مجھے کسی ایسے گاؤں کا پتہ بتائیے جس میں پنگھٹ ہوں۔ نیموں کے جھنڈ رہے ہوں، لہلہاتے کھیت ہوں۔ بھدی منڈیریں اور آڑی سیدھی گلیاں ہوں۔ جہاں کی چوپالیں آدھی آدھی رات تک قہقہوں سے گونجتی رہیں۔ جہاں کی مسجدوں میں سیدھے سادے نمازی اور جہاں کے مندروں میں بھولے بھالے پجاری ہوں۔ جہاں کی لڑکیاں کھلے آنگنوں میں رنگین چرخے کاتیں اور نیم اندھیرے کنجوں میں پینگیں بڑھاتے ہوئے رسیلے گیت گائیں۔ جہاں ــــــ" محمود بے خواب ہوگیا تھا!

ٹکٹ بابو محمود کی بات کاٹ کر بولا "معاف کیجئے گا۔ آپ بات کر رہے تھے۔ دُور دور تک گاؤں بکھرے ہوئے ہیں۔ ان پہاڑوں میں نزدیک کے گاؤں بتائے دیتا ہوں۔ یہ پگڈنڈی سیدھی کُنڈ کو جاتی ہے۔ اُس کمان سی پگڈنڈی پر جو بہہ رہے۔ اِس سامنے والی پگڈنڈی پر آپ کو کھوا ہی ملے گی۔ وُہ درختوں کے درمیان پتلی سی راہ ــــــ وہ جس کے آس پاس گائیں چر رہی ہیں ــــــ یہ ہندی پور جاتی ہے۔ اور ــــــ"

محمود جھٹ بول اُٹھا "ہندی پور؟ معاف کیجئے گا۔ آپ بات کر رہے تھے۔ ہندی پور ٹھیک رہے گا" اور ہندی کی خوشبو میں لپٹے ہوئے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے "پلٹنے پر ملاقات ہوگی آپ سے!"

بابو مسکرایا جیسے کہہ رہا ہے "تو کیا پلٹے گا ہندی پور میں نہ وہاں لارنس باغ نہ ٹھنڈی سڑک۔ نہ شملہ پہاڑی۔ اور تیری چال ڈھال بتا رہی ہے کہ تو پتھریلی گلیوں کے کنارے، کچے گھروندوں کا سہارا لے کر بیٹھنے والے دیہاتیوں سے ــــــ خیر!" ــــــ وہ ٹکٹ گننے لگا۔

ہندی پور ننھا سا گاؤں تھا۔ گارے میں جکڑے ہوئے گول مول پتھروں کے ذوزنقہ کی شکل کے گھروندے۔ کنکروں سے پٹی ہوئی گلیاں۔ مٹیالے کھدر کے لباس پہنے ہوئے کڑیل گبرو۔ اور سر پر گاگروں کی قطار جمائے ہوئے لمبے لمبے ڈگ بھرتی پنہاریاں۔ جن کی گوری کلائیوں کو جست کی چوڑیوں نے میلا کر دیا تھا۔ گاؤں سے پورب کی طرف ایک گھاٹی پر ننھا سا جھرنا جس کا پانی ٹخنوں ٹخنوں تھا۔ گاہے ماہے کہیں الغوزے بجتے۔ کبھی کبھی کسی دُور اُفتادہ چوٹی سے کسی دوہے کی بھنک پڑ جاتی۔ ورنہ ہر طرف سکوت طاری تھا۔ جس کو بچھڑوں کے ڈکرانے اور بوڑھوں کی کھانسی کی ہوں ہوں نے زیادہ شدید کر دیا تھا۔

محمود گاؤں میں داخل ہوا۔ تو کھویا کھویا۔ ایک گبرو سے چوپال کا پتہ پوچھا۔ تو جواب ملا "چوپال بند ہے آج کل۔ نمبردار کی سالی مر گئی ہے، کوئی دوسری چوپال یہاں ملنے کی نہیں۔ بالشت بھر کا تو گاؤں ہے۔ تو مسافر لگتا ہے مجھے۔ سامنے مسجد میں پڑ رہ"

"مگر اِس کے مینار"؟ محمود کے دماغ پر لاہور کی شاہی مسجد سوار تھی!

"مینار بنا بھی یہ مسجد ہی ہے۔ مسجد کی پہچان مینار نہیں محراب ہے" گبرو مسکرایا۔

محمود مسجد میں آیا۔ صحن کے باہر ایک کھاٹ پر بیٹھ کر بیگ سے پاک کپڑے نکالے۔ وضو کیا اور نماز پڑھنے لگا۔ بڑا مزا آیا اُسے نماز پڑھنے میں۔ کیونکہ قریب ہی ڈھول اور شہنائیاں بج رہی تھیں۔ اور ڈھول اور شہنائیاں بیاہ کی نشانیاں ہیں۔ اور پنجابی دیہات کے بیاہ اپنی خصوصیات کے لئے منفرد ہیں! ایک بار پہلو کی گلی میں چند پنہاریاں جاتی نظر آئیں۔ موٹی موٹی ضخیم کتابوں کی تفسیریں اب اُس کے سامنے گھومتی پھر رہی تھیں۔ لیکن مسجد کا احترام لازم تھا۔ کنکھیوں سے اُس نے کچھ کوشش بھی کی دیکھنے کی۔ مگر پنہاریاں تیز گام ہوتی ہیں۔ گاؤں کی گلیاں یک لخت ایک طرف

مڑ جاتی ہیں۔ اور پھر کنکھیوں سے دیکھنا بھی تو دیکھنے کا منہ چڑانا ہے!
دعا سے فارغ ہوا تو امام صاحب کے قریب کھسک آیا، اور بولا: "اجازت ہو تو کچھ عرض کروں؟"

"کہو کہو" امام صاحب تسبیح کے دانوں کی گنتی جاری رکھتے ہوئے بولے: "شہری معلوم ہوتے ہو؟"

"جی شہری ہوں، دیہات کی معاشرت کے متعلق ایک کتاب لکھنے والا ہوں، ھندی پور بڑا پیارا گاؤں ہے، یہاں کے لوگوں کی سادگی اور شرافت کے چرچے سن کر مناسب سمجھا، کہ اپنا دلچسپ سفر یہیں سے شروع کروں۔ آپ یہیں کے رہنے والے ہیں نا؟"

امام صاحب مسکرا کر بولے: "نہیں۔ میں ہری پور ہزارہ کا پٹھان ہوں، پندرہ برس سے رہتا ہوں اس گاؤں میں، خدمت کر رہا ہوں بھولے دہقانوں کی۔"

محمود ھندی پور اور ہری پور کی ٹکر سے جھینپ سا گیا۔ بولا۔ "پندرہ برس سے؟ تو یہ کہیئے نا کہ آپ کی جائے پیدائش ہری پور ہے، لیکن آپ رہنے والے ہندی پور کے ہیں —— تو حضرت میں یہ کہنا چاہتا تھا، کہ کیا میں چندروز یہاں حجرے میں رہ سکتا ہوں؟"

امام صاحب کی تسبیح کی روانی رک گئی: "لاحول ولا قوۃ۔ سیاح لوگ مسجد کے حجروں میں کیسے رہ سکتے ہیں؛ پردیسی طلباء کے لئے بنا رکھے ہیں یہ گھروندے۔"

"تو میں آپ سے کریما کے سبق لے لیا کروں گا۔" محمود جھٹ بول اٹھا۔

اور پھر جب امام صاحب کو معلوم ہوا کہ محمود کھاتا پیتا نوجوان ہے تو گھر سے اس کے لیے توشک اور تکیہ لے آئے، اور نمازیوں میں مشہور کر دیا، کہ یہ گبرو بڑا اللہ والا ہے؛ لکھپتی ہے پر علم دین حاصل کرنے کے لیئے سوکھے ٹکڑے قبول کر لیئے تمہارے یقیناً اسلام پھر کروٹ بدل رہا ہے!"

نمازی محمود کی ادھ کتری مونچھوں کے آخری مصنوعی خم کو دیکھکر پہلو بدلنے لگے، اور پھر جیسے دامن چھڑانے کے لئے بولے: "اچھی بات ہے؛ اچھی بات ہے"—— اور پھر ایک طرف ہٹ کر "سرگوشیاں کرنے لگے": "پر یہ فرنگیوں کے سے رنگ ڈھنگ، یہ کہنیوں تک آستینیں۔ یہ کانوں کی لووں تک بالوں کے گچھے۔ یوں بات کرتا ہے جیسے تحصیلدار ہے عدالت میں بیٹھا ہوا۔ یہ کریما پڑھے تو میرا نام بدل دینا۔ شیر جنگ کی جگہ جھینگڑا کہہ دینا" —— "خفیہ پولیس" طوطے کی چونچ ایسی ناک والا ایک بوڑھا نسوار کی ڈبیا کو چٹکی سے بجاتے ہوئے بولا: "سمجھے؟ خفیہ پولس۔ مولسی کے کان نہ کاٹ لیئے جائے تو جو جی میں آئے کہنا"

لیکن محمود ان سرگوشیوں سے بے خبر اپنے حجرے میں بیٹھا کیمرے کو صاف کرتا رہا۔ اور پھر اسے بغل میں لٹکا تا مسجد کی سیڑھیاں اترا۔ پاس ہی ایک لڑکا گزر رہا تھا۔ اس کے سر پہ ہاتھ پھیر کر پوچھا: "شادی والا گھر کدھر ہے میاں صاحبزادے؟"

"میں صاحبزادہ نہیں" لڑکا بولا: "میں تو لکھا چار کا لڑکا ہوں۔ ہاں"

"پر شادی والا گھر کدھر ہے لکھے چار کے لڑکے؟"

محمود دیہاتی بچوں سے اپنا نفسیاتی کھیل شروع کر رہا تھا۔

لڑکا بولا: "پوربی محلے کی بڑی گلی میں" اور پھر ناچتا کودتا ایک طرف نکل گیا۔ اور چیخنے لگا۔ "کل بازار لگے گا۔ بڑی گلی میں بنجارا آیا ہے، پٹلنے اور سرمہ اور بھنبھیریاں خریدیں گے ہم!"

محمود گھبرایا ضرور مگر اس غلط فہمی کو چار بچے کی نادانی پر محمول کر کے شادی والے گھر کی تلاش میں چل کھڑا ہوا۔ اور جب ڈھول کی آواز کو ٹٹولتا وہ ایک گلی کا کافی حصہ طے کر لیتا تو سامنے رستہ بند ہو جاتا اور وہ ہرتا پھرتا پھر مسجد کے قریب آنکلتا، کہیں کہیں کتے اس پر جھپٹتے، کتوں کو بھونکتا سن کر باڑوں میں بکریاں اور بھیڑیں ممیاتیں اور چھتوں پر بیٹھی ہوئی عورتوں کی گودیوں میں سوئے ہوئے بچے چونک کر بلبلا اٹھتے، آخر جب وہ شادی والے گھر کے قریب پہنچا۔ تو اسے معلوم ہوا کہ یہاں لڑکیاں الگ گاتی ہیں اور لڑکے الگ۔ یہاں دلّی پاروالی ریتیں نہیں چلتیں!۔

محمود نے سوچا: "مگر دیہاتی فلموں میں تو میں نے کئی مرتبہ لڑکے لڑکیوں کو اکٹھے ناچتے گاتے دیکھا ہے، یہ عجیب گاؤں ہے، کہیں میں باغستان میں تو نہیں آگیا!"

لیکن یہ باغستان نہیں تھا۔ پنجاب کا ننھا منا سا گاؤں تھا، جہاں حسن و عشق کو کھل کھیلنے کے ڈھب نہیں آتے۔!

بے شمار لڑکیوں کی پتلی پتلی آوازوں کی حیرت انگیز ہم آہنگی سے وہ لذت یاب ضرور ہوا۔ اس کے کانوں میں روشن تاروں۔ پیلے چاند۔ اودے آسمان۔ سرمئی آنکھوں، طلائی بالوں اور رس بھرے ہونٹوں کی بھنک پڑتی رہی، اس نے شہروں کے متعلق بھی ایک گیت سنا، جس کا مفہوم یہ تھا کہ "میرے محبوب، شہر کی طرف مزدوری پر نہ جائیو کیونکہ وہاں بے رحم ریلیں اور اندھی لاریاں ہیں، وہاں کچہریاں اور جیل خانے ہیں، اور یہاں مہندی پور میں نرم رو چھکڑے اور برق رفتار گھوڑیاں ہیں۔ لہلہاتے کھیت اور پرامن چوپالیں ہیں، مزدوری کے لیئے شہروں کی طرف نہ جائیو میرے محبوب!" ——— گیتوں کی اس پھلواری سے یہ گرد آلود گری پڑی کلیاں چن کر وہ واپس آیا اور چوپال پر جا نکلا!

کوشش کی کہ لوگ اس کی طرف حیرت سے دیکھنے کے بجائے اس سے سیاسیات کی موجودہ تحریکات، ادبیات کی موجودہ رجحانات اور مذہب کے موجودہ میلانات کے متعلق سوال کریں مگر وہ اپنے محبوب موضوع چھیڑے بیٹھے تھے: "برساتی نالے کے پانی کا رخ بدلنے کی ایک ہی کہی! میں نے تو ذرا سا ڈھلوان بنا دیا ہے پگڈنڈی کو۔ منوں پانی تیرے کھیت میں جائے گا تو چلو بھر ادھر بھی آ نکلے گا۔ اللہ کی دی ہوئی نعمت پر کسی کا اجارہ تھوڑا ہے!" ——— "بات کرو پچھمی گھٹاؤں کی، جو برستی ہیں تو جل تھل ایک کر دیتی ہیں۔ پوربی گھٹاؤں پر تو اللہ کی مار ہے، گرجتی دھاڑتی ابھرتی ہیں، اور ہوا میں اڑتے ہوئے کبوتروں کی سی دو چار سی پھینکتی گھس جاتی ہیں آسمانوں میں ——— میں نے تو کبھی پوربی گھٹا کو برستے نہ دیکھا!
——— "میں نے دیکھا تھا لاہور میں" ——— "لاہور میں؟ ارے پگلے۔ بزرگوں کے منہ آتا ہے! لاہور میں تو پچھم پورب ہو جاتا ہے اور پورب پچھم!" ——— بلند قہقہوں میں محمود نے بھی حصہ لیا مگر یونہی بے تحاشا۔ بے ڈھنگے اور مصنوعی انداز میں ——— جیسے اپنے پیٹ میں خود ہی گدگدیاں کر رہا ہے! — — دیر تک کسی موقع کے انتظار میں رہا مگر سوشلزم کی اصطلاحات کو چباتا رہ گیا!

حجرے سے باہر کھاٹ پر لیٹا تو کھویا کھویا۔ تھکا ہارا تو تھا ہی، نیند آگئی۔ اور جب صبح کو اٹھا۔ تو کیمرہ بغل میں لٹکاتا پنگھٹ پر جا نکلا۔ مگر ایک پنہارے سے یہ انکشاف سن کر ہونقا سا رہ گیا۔ کہ مردوں کے لیئے پنگھٹ کا پرلا کنارہ مقرر ہے، ادھر لڑکیوں کے آس پاس کوئی چھوکرا گھومتا نظر آئے تو پنچایت الٹا لٹکا۔ ے کسی درخت سے!

کیمرے کے نرم چمڑے پر ہاتھ پھیرتا واپس آیا۔ رستے میں ایک لوہار کی دکان پڑتی تھی۔ بوڑھا لوہار بھٹی میں لوہا گرم کرکے اہرنی پر رکھ رہا تھا اور آس پاس بیٹھے ہوئے دہقانوں سے کہہ رہا تھا: "لو بھئی۔ اٹھاؤ ہتھوڑا۔ دیکھوں تو تم کتنے پانی میں ہو، سیدھی اور جمی ہوئی ضرب لگانا۔ کمہارے کا پھل ہے! چپٹا ہونا چاہیے، گولائی ہوئی ذرا سی تو چودھری سر ہو جائے گا، ——— ٹھکا ٹھک ہتوڑے چلنے لگے۔ اہرنی پر دہکتا ہوا لوہا کروٹیں بدلنے لگا، کہ اچانک محمود آگے لپکا۔ اور بولا: "بھئی ہتھوڑا دینا مجھے، میں بھی تو دیکھوں ذرا!" ——— ہتھوڑا تھام کر اوپر اٹھایا تو ڈگمگا گیا۔ قدم جمانے تو ہتھوڑا اپنے ہی گھٹنے سے ٹکرا گیا۔ درد کی شدت کو بڑی مشکل سے برداشت کرکے بدحواسی میں ہتھوڑا گھما کر اہرنی پر مارنا چاہا تو ساتھ ہی خود بھی لڑھک گیا! سنبھل کر اٹھا تو دہقان ہنسی سے زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے اور لوہار لوہے کے ٹکڑے کو انگاروں پر دھرتے ہوئے کہہ رہا تھا: "کچھ دن باقی تھے جو ہتھوڑا میرے سر سے بالشت بھر کے فاصلے سے گزر گیا۔ ورنہ لوہے کی جگہ انگاروں پر میری کھوپڑی کے ٹکڑے سلگ رہے ہوتے۔ واہ رے شہری بابو۔ آئے تھے وہاں سے کرپا پڑھنے۔ تو ہتھوڑا اٹھا کے چلا گئے

قلم ملایا کر قلم ! ؟

اگر لوہار کی دکان کے سامنے کوئی کنواں ہوتا تو محمود ضرور چھلانگ لگا دیتا اُس میں۔ کترا کر باہر نکلا۔ اور گاؤں سے پرے ایک چٹان پر بیٹھ کر کتابوں کی رٹی ہوئی تحریروں کو اپنے دماغ کی سلوٹوں میں سے کریدتا رہا۔

دو چار روز اُس نے گلیوں کے بے مطلب چکر لگائے، کہ محض اتفاق سے، یونہیں جاتے جاتے ——— بھولے سے ---- ——تقدیر پلٹا کھائے اور کوئی لڑکی مُسکرا دے ——— اور اُس کے محبوب مصنفین کی تحریریں اُس کے ذاتی تجربات کی زد میں آ کر اور اُجاگر ہو جائیں ——— مگر وہ چلتی پھرتی بجلیاں اُسے دیکھ کر ازو بلند کر کے گاگریں سنبھالتیں اور غصیلی ناگنوں کی طرح موڑ کاٹ جاتیں !

گاؤں سے نکل کر کھیتوں کے چکر کاٹنے لگا۔ مگر کھر پے چلاتی ہوئی لڑکیوں کے دھوپ سے تپے ہوئے پُرجلال چہرے دیکھ کر اُس کے دماغ کی نسیں نئے طنبورے کے تاروں کی طرح کھچ کر رہ جاتیں۔ اور ایک بار تو ایک گنجان کھیت سے قہقہے سے بلند ہوئے اور پھر آواز آئی " یہ مسافر کیسے چلتا ہے گلا بو ! بالکل پدی کی طرح۔ پھدک پھدک ! پھدک پھدک ! شہری لگتا ہے مجھے "

" بڑے فسادی ہوتے ہیں یہ شہری " دوسری بولی " فرنگی نے اُنھیں کئی جادو سکھا رکھے ہیں "

محمود ان کی باتیں سُننے کے لئے ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا تو پیچھے سے کسی نے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ پلٹ کر دیکھا ایک اَدھیڑ عمر دہقان لال لال آنکھیں نکالے اُسے گھور رہا تھا۔ " کیا کر رہے ہو یہاں ؟ "

" میں ——— میں ——— " محمود کو تعزیرات کی سب دفعات اور اُن کی سب تاویلیں بھول گئیں۔ " میں سیر کر رہا تھا "

" سیر کر رہا تھا ؟ " دہقان نے محمود کے الفاظ طنزاً دہرائے " تو پردیسی ہے، مسجد میں رہتا ہے، کریا پڑھتا ہے ورنہ وہ بے بھاؤ کی لگاتا کہ سیر وَیر کے مزے بھول جاتے ابچہ جی کو ——— تو مجھے اشراف لگتا تھا پر یہ کھیتوں میں ہماری بہو بیٹیوں کو جھانکنا تو اَشرافوں کا کام نہیں ؛ یہ تو کمینوں کے چلن ہیں ! "

اُدھر سے ایک بوڑھا لاٹھی ٹیکتا آیا۔ اور اَدھیڑ عمر دہقان کا ہاتھ تھام کر بولا۔ " رہنے دے اللہ نواز۔ میں سمجھتا ہوں بیچارے کو " اور پھر محمود کا بازو پکڑ کر ایک طرف جانے لگا ؛ دونوں لڑکیاں ایک ہاتھ میں خمیدہ درانتیاں اُٹھائے دوسرے ہاتھ سے اُڑتی ہوئی اوڑھنیاں سنبھال رہی تھیں۔ اور بہت دور کسی گھاٹی میں کوئی چرواہا گا رہا تھا ؎

گوری چالاں چلے البیلیاں
موراں نوں مات کرے !
گوری کالیاں زلفاں کھولیاں
دناں نوں رات کرے !
گوری منڈے دلوں اکھیاں پھیریاں
بھُل کے ناں بات کرے !

گیت کا ہر لفظ لوہار کے بھاری بھرکم ہتھوڑے کی ضربیں بن کر محمود کی شکست خوردہ تصورات کو کچلے دے رہا تھا کہ اچانک بوڑھا رُک گیا۔ اور بولا " دیکھ بھئی۔ تجھے بھلے کی بات کہوں۔ گلیوں میں ننگے سر نہ پھرا کر۔ پنگھٹ پر نہ جایا کر تصویریں نہ اُتارا کر۔ سمجھا ؟ کسی جی جلے کے پالے پڑا تو پکڑ کر اُلو کر دے گا۔ جوانی میں نے شہروں میں گزاری ہے، وہاں کس چیز کی کمی ہے آخر ! لڑکیاں دیکھنی ہوں تو تھیٹر چلے جاؤ گیت سُننے ہوں تو گراموفون خرید لو۔ تصویریں اُتارنی ہوں تو باغ موجود ہیں۔ ہماری لڑکیاں کھیل تماشے نہیں کرتیں۔ یہ لاہور نہیں۔ بے چارا ہندی ہو رہے۔ سنبھال اپنے آپ کو "

محمود کا جبڑہ لٹک گیا۔ بولا " خیال رکھوں گا "

جب وہ پلٹا تو لہلہاتے ہوئے کھیت زہر کے موجیں مارتے ہوئے سمندر بن گئے۔ آس پاس ڈھلانوں پر چرواہوں کے سائے ڈائنوں کی شکل اختیار کر گئے۔ حجرے میں گیا۔ تھیلا اُٹھایا۔ اور باہر جانے لگا۔ تو امام صاحب جو مسجد کی

سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ بولے "کہاں چلے مسافر میاں؟ تم سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔"

"میں سن چکا ہوں سب باتیں۔" محمود بولا۔ "آپ کی مہربانیوں کا شکریہ۔ السّلام علیکم۔"

"وعلیکم السّلام و رحمتہ اللہ و برکاتہٗ۔ لیکن ——"

امام صاحب نے گھبرائے ہوئے محمود کو مہربان نظروں سے دیکھا۔ "لیکن سنبھل کر جانا بچے۔ چوپال سے کترا کر دکانوں والی گلی سے نکل جانا۔ تصویروں والی کل چھپا لینا کہیں۔ دہقان بگڑے بیٹھے ہیں اِس چوپال پر —— تمہارے متعلق پنچایت ہونے والی ہے۔"

وہ گاؤں سے نکل کر جب ایک درے میں پہنچا تو مڑ کر ہندی پور کو دیکھا —— اِتنی وسیع دنیا میں ایک بھورا سا حقیر دھبہ —— جیسے کھلے میدان پر مری ہوئی چوہیا —— کیڑوں سے بھری ہوئی! —— بدبو سے سڑی ہوئی! —— اجڈ گنواروں کا وطن —— آریوں کی آمد سے پہلے کا ہندوستان —— جس نے ایک پڑھے لکھے کھاتے پیتے شہری کو اُگل دیا تھا!

اِسٹیشن پر آ کر ٹکٹ خریدنے لگا تو کھڑکی کی پرلی طرف سے بابو بولا۔ "یسر ہو گئی مسٹر؟"

"جی ہو گئی۔" محمود بولا۔

"اب تک ہو جانی چاہیئے تھی۔" بابو نے کھٹاک سے ٹکٹ نیچے کیا اور محمود کی طرف پھینک دیا!

گاڑی میں آ کر بیٹھا۔ گھبرایا ہوا تو تھا ہی، لوگ گھور گھور کر دیکھنے لگے، قریب ہی بیٹھے ہوئے دہقان نے شریر مسکراہٹ کو ہونٹوں کے پیچھے دبائے رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "بابو جی۔ آپ کے منہ پر مکھی بیٹھی ہے۔"

اور محمود بگڑ کر بولا۔ "ہاں ہاں بیٹھی ہے، بیٹھی رہنے دو۔ تمہیں کیا؟"

شریر دہقان بولا۔ "مگر کیا آپ نے کوئی میٹھی ——"

"ہاں ہاں۔ میں نے رس گلے کھائے ہیں!"

محمود گرج اٹھا۔ لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد سارا کمرہ کرخت قہقہوں سے گونج اٹھا اور اگلے اِسٹیشن پر محمود دوسرے ڈبے میں سوار ہو گیا۔

اور جب لاہور پہنچا تو منشی کو بلایا اور بولا۔ "دیکھو منشی۔ یہ جو دہقان آتے ہیں نا مقدمے لے کر۔ یہ دس روپے کہیں، تو تم سو کہو، یہ سو کہیں تو تم ہزار کہو۔ شہر کے مقدمہ باز سیٹھوں سے یارانہ گانٹھو۔ اور دیکھو۔ وہ الماری کے نچلے خانوں میں جو موٹی موٹی کتابیں پڑی ہیں نا؟ انہیں کسی حلوائی کے ہاں بیچ دو۔ آج کل ردّی مہنگی ہو رہی ہے!"

تقدیریں

از منظور بخاری بی اے

انسانی زندگی میں کیسے کیسے جوہر پوشیدہ ہیں۔ اور دنیا میں انسان نے کیسی کیسی مشکلات پر قابو پاکر ترقی کی، بڑے بڑے انسانوں کی ایجادیں اور تصنیفیں کس طرح ظہور پذیر ہو سکیں۔ وہ کیا حالات ہیں جس سے کسی انسان میں بڑا بننے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ کیوں اور کس طرح کوئی انسان یک بہ یک ہماری نگاہوں میں ممتاز شخصیت بن جاتا ہے۔ ایسے روح پرور سوالات کا جواب آپ کو

تقدیریں

دے سکتی ہیں جس سے آپ پر ظاہر ہوگا کہ کسطرح آج کا حقیر پیشہ ور کل کا ذی مرتبت انسان بن گیا۔ (زیر طبع)

سیلاب

سیلاب ہندوستان کے اس شاعر کے نو افسانوں اور ایک ڈرامہ کا مجموعہ ہے جو سنی سنائی باتیں کہنے کا عادی نہیں۔ جسکی بصارت مغربی عینک کی مرہون منت نہیں۔ اور جس نے ہندوستان کو جیسا دیکھا اور پایا ہے ویسا ہی دلاویز کہانیوں کی صورت میں پیش کردیا ہے "احمد ندیم قاسمی"

سیلاب کے افسانوں میں آپکو اپنے حقیقی رنگ کی اوج کمال پر نظر آئے گا۔ اسکی کہانیوں میں دھڑکتا ہوا گہرا احساس، سنجیدہ تفکر اور باریک مشاہدہ آپکو مبہوت کر دیگا اور آپ یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ ہندوستانی دیہات کے اس نوجوان عکاس نے اردو ادب میں جس نئے باب کا اضافہ کیا ہے وہ کس قدر اہم، خوبصورت اور غیر فانی ہے پہلے آپنے اسکے افسانوں کا مجموعہ "گرداب" پڑھا اب "سیلاب" پڑھئے اور دیکھئے کہ ہمارے ہونہار ادیب کا تخیل کس قدر شاداب اور بے لوث ہے

زیر طبع

ادارۂ اشاعت اردو - عابد روڈ - حیدرآباد دکن

خطاب بہ اسلامیان

جناب مولوی عبدالرحمن خاں صاحب رضا سابق متعلم
(جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد)

اے مسلم خوابیدہ از آواز اذان خیز | دنیا ہمہ بیدار و تو در خواب گراں خیز
از نالۂ نومیدی دل سوختگاں خیز | از شورش سرگرم عمل ہمنفساں خیز

از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز

مشرق ز شفق سرخ چو یک چشمہ خون است | در پیش شیاطیں سر انساں نگوں است
آفاق پر از فتنہ و آشوب و جنون است | تکبیر ز دل گوئے و بتائید اماں خیز

از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز

"تہذیب" طرفدار تعدی شد و اجبار | در صورت انسان شدہ ابلیس نمودار
ہر قوم بہ قوم دگر آمادۂ پیکار | اخلاص بدست آر و بتالیف دلاں خیز

از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز

عالم ز تعصب شدہ است احمق و امی | تلقین مذاہب ہمہ بے مطلب و معنے
ایماں متزلزل ز سراب زر دنیا | قرآں بہ بغل گیر و بہ تعلیم جہاں خیز

از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز

تو وارث گنجینۂ ایمان و یقینی | تعبیر روا داری و دانائی و دینی
پیغام ازل را تو مبلغ بزمینی | بر مسلک توحید ز سودائے بتاں خیز

از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز

در جسم ہوا لرزہ ز لیارۂ جنگ است | بر طفل و زن و پیر بسر بارش سنگ است
شرمندہ ز افعال بشر خرس و پلنگ است | از ہند و عرب ترک و عجم نعرہ زناں خیز

از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز

فریاد ز "تہذیب" و سیہ کاری "تہذیب" | فریاد ز بے دینی و غداری "تہذیب"
دنیا ہمہ در نزع ز خونخواری "تہذیب" | اے مسلم خوابیدہ باحیاء جہاں خیز

از خواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز

علیم الدین صاحب محبت
ایم۔ اے

حکیم الشعراء امجد حیدرآبادی

شیراز کی سرزمین نے ساتویں صدی ہجری میں ایک شاعر پیدا کیا جس نے حکمت و عرفان کے پھولوں سے گلستان و بوستان تیار کئے اور اُس کی جاں فزا خوشبو نے مشرق و مغرب کو معطر کر دیا۔ چودھویں صدی میں سرزمین حیدرآباد نے ایک دوسرا سعدی پیدا کیا جسے ہم امجد کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے امجد کو حکیم الشعراء کا لقب دے کر شاعر کو صحیح مقام دیا۔ لقب بہت دئے جاتے ہیں مگر اتنا صحیح لقب شاید دوسروں کو نہیں ملا ہوگا۔

یہ مقالہ جناب علیم الدین محبت صاحب ایم۔ اے کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جو موصوف نے امتحان ایم۔ اے کے لئے پیش کیا تھا۔ نوجوان ادیب محبت نے جس وقتِ نظر سے امجد کا مطالعہ کیا ہے وہ قابلِ داد ہے، ہم شکریہ کے ساتھ جناب محبت کے اِس مقالہ کو ناظرین کرام کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ (مدیر)

پہلا باب

حالاتِ زندگی

پیدائش۔ وطن۔ نام امجد کا نام ابوالاعظم سید احمد حسین اور تخلص امجد ہے۔ آپ کے والد مولوی سید رحیم علی کسی مسجد کے اِمام تھے جنھیں یکے بعد دیگرے چار بیویوں سے بیس بچے پیدا ہوئے مگر قضاء کے ہاتھ سے ایک بھی نہ بچا۔ اکیسویں بچے امجد ہیں جو ۱۳۰۵ھ ۱/ رجب روز دوشنبہ صبح کے وقت حیدرآباد دکن میں تولد ہوئے۔ امجد ابھی چالیس ہی دن کے تھے کہ اُن کے والد نماز فجر سے واپس آتے ہوئے مرض فالج سے آناً "فاناً" اِنتقال کر گئے۔ چھلہ کی رسم میں مہمانوں سے بھرا ہوا گھر دم بھر میں ماتم کدہ بن گیا۔ جو پانی زچہ اور اُس کے بچہ کے نہلانے کے لئے گرم کیا گیا تھا وہ صاحب خانہ کے غسل میت کے کام آیا۔

بچپن امجد کے پیدا ہونے سے پہلے اُن کی والدہ صوفیہ کی ایک لڑکی مر چکی تھی۔ ابھی یہ زخم ہرا ہی تھا کہ شوہر نے بھی ایک اور داغ دیا۔ لے دے کر اَب گھر کا چراغ امجد ہی تھے۔ غم نصیب ماں نے اِس لخت جگر کی پرورش میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔

تعلیم و تربیت چالیس دن کے یتیم بچے کو پروان چڑھانے اور تعلیم دلانے میں ایک بے کس اور بیوہ نے جو جو مصیبتیں اُٹھائیں وہ ناقابل بیان ہیں۔ اگرچہ عزیز و اَقارب مر چکے تھے شوہر کا سایہ سر سے اُٹھ چکا تھا مگر اُس ماں نے رسم کے موافق خانگی طور پر قرآنِ مجید اور اُردو کی دو ایک کتابیں ختم کرا دیں اور مدرسہ میں بھی داخل کرا دیا گو امجد کو تعلیم سے زیادہ رغبت نہ تھی لیکن حافظہ قوی ہونے کی وجہ سے جو کچھ پڑھتے وہ پتھر کی لکیر ہو جاتا تھا

مکتب کی ابتدائی تعلیم کے بعد امجد پر باب العلم کھلا اور حیدرآباد دکن کی ایک برگزیدہ درس گاہ نظامیہ میں ۱۳۱۶ھ میں شریک ہوگئے مگر وہاں بھی باضابطہ تعلیم نہیں پائی۔ تطلبی تک پہنچنے کے بعد ۶ سال میں مدرسہ کو خیرباد کہہ دیا۔ خانگی طور پر علامہ سید علی شوستری شاد الملک سے فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ انھیں دنوں پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات منشی، منشی عالم اور منشی فاضل میں کامیاب ہوئے۔ ملازمت کے بعد بھی طالب علمی کا سلسلہ جاری رہا اور استاذ فلسفہ مولانا سید نادر الدین مرحوم سے فیض حاصل کرتے رہے۔

اساتذہ

یہ عربی مثل بالکل صحیح ہے کہ "شاعر کو مبدائے فیض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہوتا" مگر یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ شاعر کا وجدان شعری اس کے مطالعہ، اس کے ماحول، اس کے اساتذہ کے رجحانات اور خیالات سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ چنانچہ امجد کو بھی مدرسہ نظامیہ میں مولوی سعید الدین سہارنپوری اور مولوی عبدالوہاب بہاری جیسے یگانۂ روزگار استاد مل گئے۔ اسی زمانے میں تحصیل علم کے شوق نے اس قدر اکسایا کہ روزانہ مدرسہ سے مولا کے پہاڑ تک جو شہر سے دس میل ہے جاتے رہے اور آغا شوستری کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کرتے رہے۔ اس کے بعد مولوی نادر الدین جیسی نادر الوجود ہستی مل گئی جس نے ان تمام جوہروں کو چمکایا جو ایک دردمند دل میں پوشیدہ تھے۔ غرض امجد کا تعلق تلمذ ایسے حضرات سے رہا جو مشاہیر وقت شمار کئے جاتے تھے اور جن میں سے ایک کو بادشاہ وقت کے استاد ہونے کا بھی شرف حاصل تھا۔

شکل۔ صورت۔ لباس و وضع

امجد گندمی رنگ کے بزرگ ہیں جسم بھاری اور قد دراز ہے۔ پیشانی۔ آنکھ۔ کان وغیرہ متوسط۔ ہلکی ہلکی مونچھیں ہیں اور ڈاڑھی منڈاتے ہیں۔ لباس تکلفات سے بری ہوتا ہے۔ جسم پر معمولی کپڑے کی شیروانی اور سر پر رومی ٹوپی ہوتی ہے۔

اخلاق و عادات

امجد نہایت خلیق، ملنسار، خوش اخلاق اور منکسر المزاج آدمی ہیں احباب اور شاگردوں سے نہایت خلق سے پیش آتے ہیں۔ ہر ملنے والا یہ سمجھتا ہے کہ وہ اسی سے زیادہ خلوص سے ملتے ہیں نیا شخص پہلی ہی ملاقات میں اُن کا گرویدہ ہوجاتا ہے اور دوبارہ ملنے کا اشتیاق رکھتا ہے۔

خودداری اور سیر چشمی

جہاں طبیعت میں منکسر المزاجی اور ملنساری ہے وہاں خودداری بھی بدرجہ غایت پائی جاتی ہے۔ وہ عاجز سے سرکشی کرنے کو کفر سمجھتے ہیں مگر مغرور کے آگے سر تسلیم خم کرنا انہیں نہیں آتا۔ سیر چشمی کا یہ حال ہے کہ کبھی وہ جاہ و حشمت کا خیال تک دل میں نہیں لاتے اور اپنی موجودہ حالت میں ہی خوش رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دولت و ثروت کے بندوں اور زر پرستوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ان کی شاعری کا دامن مدحیہ قصائد سے پاک ہے۔ ان کا یہ خیال ہے کہ فقیر اپنے کمبل ہی میں مست ہے چنانچہ ایک رباعی میں فرماتے ہیں۔

ہر وقت خدا پر جو نظر رکھتے ہیں
کب دل میں خیال سیم و زر رکھتے ہیں
شاہوں کو ہو بحر و بر مبارک امجد
عاشق لب خشک و چشم تر رکھتے ہیں

احسان شناسی

امجد کا خاص جوہر اُن کی احسان شناسی ہے وہ یہ نہیں دیکھتے کہ احسان کرنیوالا کس درجہ کا آدمی ہے دوست ہے یا شاگرد۔ استاد ہے یا بزرگ۔ جس کسی نے ایک مرتبہ احسان کر دیا وہ اس کے حق میں ہمیشہ دعا کرتے رہتے ہیں اور جب کبھی یاد کرتے ہیں تو کلمۂ تحسین زبان پر جاری ہوجاتا ہے۔

سفر بنگلور

سنہ ۱۳۲۵ھ میں ۲۰ سال کی عمر میں کسی خانگی وجہ سے اپنی عزیز ماں سے بگڑ کر امجد بنگلور چلے گئے نیا مقام تھا کہیں ٹھیرنے کو جگہ نہ ملی تو کنٹونمنٹ کے عیسائی مشن میں اتر پڑے۔ مشن میں تعلیم بھی دیا کرتے اور رہنے

کرسچینوں اور پادریوں سے مذہبی مباحثے بھی کیا کرتے تھے اور اتوار کے دن پادری صاحب شہر میں تبلیغ کے لئے جاتے تو آمجد بھی اُن کے ہمراہ ہو لیتے تھے۔ لطف یہ تھا کہ ایک طرف پادری صاحب کھڑے عیسوی اُرگن بجاتے تھے تو دوسری طرف آمجد دین محمدی کی اِشاعت کیا کرتے کام ختم کرکے دونوں ایک ہی گاڑی میں مشن کو لوٹتے تھے۔ آمجد کی اِس رَوش نے بنگلور کے سارے مسلمانوں کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ کوئی اُنھیں عیسائی کہتا تھا اور کوئی مسلمان۔

سفرِ حج ۱۳۳۶ھ میں ۴۱ سال کی عمر میں آمجد نے وہاں کا سفر کیا جہاں سے آفتابِ اِسلام طلوع ہوا تھا اور اپنے نبیؐ کی مقدس بارگاہ میں درودوں کے پھولوں کا تحفہ لے کر پہنچے۔ آمجد کا یہ سفر گو صرف ۶ مہینے پر مشتمل تھا مگر ہما و شما کی طرح رسمی نہ تھا۔ وہ ارضِ مقدس سے زاہدانِ خشک کی طرح صرف تسبیح۔ کھجور۔ زمزم۔ مسواک اور سرمہ نہیں لائے بلکہ ہندی پیالے میں حجازی مے کر آئے جس کے ہر قطرے میں معرفت کا ایک دریا تھا۔ وہ اُس سے زیادہ اور بھی کچھ لاتے مگر شہنشاہِ روحانیت کے دربار میں پہنچنے کے بعد بے خودی نے اِس قدر خود فراموش کر دیا کہ کسی چیز کی خبر نہ رہی۔ بقولِ آمجد

"آنکھ محوِ دید تھی اِتنا تو مجھ کو ہوش ہے"

باوجود اِن حالات کے آمجد نے اپنے حجازی تاثرات کو احباب کے اِصرار پر حج امجد کے نام سے کتابی صورت میں پیش کر دیا ہے اِسی کو سفرِ حج کی سوغات سمجھنا چاہیئے۔

ملازمت آمجد کی ملازمت کی پہلی منزل درس و تدریس سے شروع ہوتی ہے جب کہ وہ ۱۳۲۲ھ میں مدرسہ چھوڑ چکے تھے۔ سخت گرانی کا زمانہ تھا۔ والد کا اندوختہ ختم ہو چکا تھا ایسے مجبور ہوئے کہ دو روپیے ماہوار پر ایک لڑکی کے پڑھانے کے لئے چار میل جایا کرتے تھے۔ سترہ اَٹھارہ سال کی عمر میں پہلی شادی ہوئی مگر اُس کے ۴ سال بعد ۱۳۲۵ھ میں بنگلور چلے گئے۔ ایک دوست کی سفارش سے کسی پارسی ڈاکٹر کے ہاں شاہ نامہ پڑھانے کے لئے اُس کے منشی بن گئے۔ چند روز کے بعد ڈاکٹر کو ان کے سابق منشی کی زبانی معلوم ہوا کہ آمجد کسی ناٹک کے ایکٹر ہیں اور کمپنی چھوڑ کر یہاں بھاگ آئے ہیں اور منیجر کمپنی ان کی تلاش میں پھر رہا ہے۔ ڈاکٹر نے آمجد سے اِس واقعہ کی تصدیق چاہی امجد نے کہا شاید یوں ہی ہو اور نوکری چھوڑ کر الگ ہوئے اِس واقعہ کے بعد اپنے اَسناد لئے ناظم تعلیمات بنگلور کے پاس پہنچ گئے۔ اُنھوں نے اسی دن سٹی اسکول میں پندرہ روپیے پر مدرس مقرر کر دیا اور آئندہ جلد ترقی کا وعدہ کیا۔ دو مہینے تک سٹی ہائی اِسکول میں مدرسی کرتے رہے کئی اِنسپکٹر تعلیمات اور پرنسپل اُن کے شاگرد ہو گئے۔ رہنے کو مدرسہ ہی کا دلچسپ اور پُر فضا مکان۔ پڑھنے کے لئے مدرسہ کا کتب خانہ۔ خدمت کے لئے مدرسہ کے طلبہ کھانے کے لئے قدر دانوں کی ضیافتیں۔ دِل بہلانے کے لئے دوستوں کے ساتھ باغوں کی تفریح۔ رقص و سَرود کے جلسے غرض وہ تمام سامان جو مسرت کو تکمیل کر سکتا تھا پردیس میں امجد کے لئے مہیا ہو گیا تھا گویا "عمر خیام محقق طوسی کے باغ میں زندگی بسر کر رہا تھا"

اِسکول میں بھی بنگلور کے مولویوں نے آمجد کو ناٹک کا ایکٹر مشہور کر کے بدنام کرتے اور اِسکول سے نکلوانے کی کوشش کی مگر پرنسپل سمجھ دار آدمی تھے اور آمجد کی قابلیت کے معترف تھے اِس لئے مسافر کش مولویوں کا کوئی خیال نہیں کیا۔ لیکن امجد اپنی والدہ کی کشش سے تین چار مہینے بعد حیدرآباد واپس ہو گئے۔

بنگلور سے آکر چند مہینے کے بعد مولوی عزیز مرزا مرحوم بی۔اے ہوم سکریٹری کی علمی قدردانی کی شہرت سُن کر ایک دن اُن کے مکان پر پہنچ گئے۔ مولوی صاحب اس وقت باہر ہی تھے۔ امجد نے سلام کر کے رباعیاتِ امجد کی ایک جلد پیش کی۔ مولوی صاحب نے کتاب ہاتھ میں لے کر فرمایا کیا مولوی امجد صاحب نے بھیجی ہے۔ شاید مولوی امجد

اُن کے تخیل کی دُنیا میں کوئی عجیب ہستی کے اِنسان تھے۔ اس وقت کتاب دینے والا کم عمر اور شکستہ حال اِنسان اُن کے خیال میں رباعیاتِ امجد کا مصنف نہیں ہوسکتا تھا۔ جھوٹے امجد نے سکرا کر کہا۔ جی ہاں یہ کتاب بھی امجد ہی نے بھیجی ہے اور پیش کرنے والا بھی امجد ہی ہے۔ مولوی صاحب امجد کی صورت دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ پھر پوچھا کیا یہ وہی رباعیاں ہیں جن کے متعلق مولانا حالی نے لکھا ہے: "تعجب ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں جو منافی شعر و سخن ہے ایسا عمدہ اور اعلیٰ مذاق شاعری کا کیوں کر پیدا ہوا؟" امجد نے کہا یہ وہی رباعیاں ہیں اس کے بعد مولوی صاحب مہربان ہوگئے اور سفارش کر کے بلدہ کے ایک مدرسہ دار العلوم میں بیس۲۰ روپیے ماہوار پر مدرس رکھوا دیا۔

چند سال بعد امجد نے دفر صدر محاسبی میں تبادلہ کرالیا اَب تک اسی دفتر میں برسرِ خدمت ہیں۔ ۴ ماہ کا عرصہ ہوتا ہے کہ امجد کو ترقی ہوئی اور وہ اِس وقت تین سو روپیے سے زائد ماہوار پا رہے ہیں۔ مگر اِس ترقی نے اُن کی زندگی پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ انھوں نے اپنی شان نہیں بڑھائی۔ اُنھوں نے موٹر نہیں خریدی بلکہ وہی پُرانی سائیکل اُن کی سواری کا کام دیتی ہے اور اس بائیسکل میں ایک کپڑے کی تھیلی بندھی رہتی ہے جو اکثر سودا سلف رکھنے کے کام آتی ہے۔ سُنا ہے کہ جس دن امجد نے اِس نئی خدمت کا جائزہ لیا تو اُنھیں گھومنے والی کرسی پر بیٹھنا پڑا۔ مگر کچھ دیر بعد جسم کے حرکات و سکنات کے ساتھ کرسی بھی گھومنے لگی تو امجد نے اُس کو بھی شان و شوکت میں شمار کیا فوراً وہ کرسی بدل ڈالی اور اپنی پہلی ہی پُرانی کرسی اُس کی جگہ رکھ لی۔

شادی

امجد نے پہلی شادی ۱۳۲۳ھ میں کی مگر تیسرے ہی سال ۱۳۲۶ھ میں رود موسیٰ کی مشہور طغیانی کا حادثہ پیش آیا جس میں امجد بارہ گھنٹے تک بہنے کے بعد ہسپتال کی بیمار عورتوں کے ذریعہ بچا لئے گئے مگر امجد کو اِس طغیانی میں اپنی آنکھوں سے پیاری بیوی۔ عزیز بچی کو قضا کے دھارے میں بہتا دیکھنا پڑا۔ یہیں سے دُنیا کی بے ثباتی کا وہ درس ملا جو بھلائے نہ بھولا۔ اِس تباہی کے چھ سال بعد ۱۳۳۲ھ میں امجد نے دوسرا عقد کیا۔ مگر اس رفیقہ نے بھی ۱۳۴۲ھ میں داغِ مفارقت دے دیا۔ کچھ زمانہ تنہائی میں گزارنے کے بعد ایک دوست کے اصرار سے تیسرا عقد کیا مگر اختلاف طبائع کی وجہ سے اس بیوی کو طلاق دینا پڑا۔ ایک سال کے بعد چوتھا عقد کیا یہ بیوی اَب تک حیات ہیں۔

شاعری کی ابتداء

امجد کی شاعری کا شعور ۱۳۲۰ھ میں بیدار ہوا جب کہ اُن کی عمر پندرہ سال کی تھی۔ شیخ ناسخ کے دیوان کے مطالعے سے اِس شوق کی اِبتداء ہوئی امجد کی شاعری کا پہلا شعر یہ ہے۔

نہیں غم گرچہ دشمن ہوگیا ہے آسماں اپنا
مگر یا رب نہ ہو نامہرباں وہ مہرباں اپنا

اِس شعر کی خوبی کا اندازہ کوئی کیا لگا سکے گا۔ جب تک طبع خداداد نہ ہو کیا ایک مُبتدی اس قدر بلند مطلع موزوں کر سکتا ہے۔

آپ نے اِبتدائی اردو غزلیں جیب[1] کنتوری کو اور فارسی کلام غلامی[2] ترکی کو دکھایا لیکن مشورہ کا سلسلہ زیادہ عرصہ تک نہ چلا اور استاد فطرت نے امجد کی موزونئی طبع کو رباعی کے قالب میں ڈھال دیا چنانچہ نظموں اور تضمینوں سے زیادہ مقبولیت رباعیوں کو ہی حاصل ہوئی۔

---

[1] سید محمد کاظم نام جیب تخلص تھا۔ کنتور کے رہنے والے تھے۔ حضرت ضامن کنتوری کے والد تھے۔ انتقال کو ۳۰۔ ۳۲ سال ہوتے ہیں۔ بلدہ میں اس وقت ان کے اکثر شاگرد موجود ہیں دیوان چھپ چکا ہے۔

[2] ترک علی شاہ ترکی نو محل (پنجاب) کے باشندے تھے۔ مولانا غلام قادر گرامی مرحوم ان کے برادر نسبتی تھے۔ ترکی درباری شاعر اور مہاراجہ کشن پرشاد بہادر۔ شاد کے مصاحب خاص تھے۔ اُردو اور فارسی میں صاحب دیوان ہیں۔ عمر طبعی کو پہنچ کر انتقال کیا۔

امجد کے شاگرد

حضرت امجد کے جملہ تلامذہ پر نظر ڈالنا ہمارے مقالہ کا مقصد نہیں ہے۔ سوانح نگاری کی قدیم سنت کا خیال کرتے ہوئے اُن کے چند شاگردوں پر سرسری طور پر لکھ دیتے ہیں۔ یُوں تو امجد کے شاگردوں میں علماء، فضلاء، مشائخ، ادیب اور شاعر سب آجاتے ہیں مگر وہ جو اُن سے زیادہ قریب ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

بازؔ میر تراب علی خاں بازؔ خوش اخلاق، خوش فکر، شاعر ہیں مطالعہ کا بے حد ذوق ہے۔ آپ کے کتب خانہ میں اس وقت کئی ہزار کتابیں موجود ہیں۔ باز ان شاگردوں میں ہیں جنھیں امجد کی زندگی کے ہر پہلو سے واقفیت ہے تنقیدات عبدالحق ـــــ حسن کے دو رُخ۔ ارمغانِ باز وغیرہ آپ کی تصنیفات میں سے ہیں۔

نصیر الدین ہاشمی مولوی نصیر الدین ہاشمی شاگرد بھی ہیں اور حضرت امجد سے روحانی عقیدت بھی رکھتے ہیں۔ اس وقت دفتر رجسٹریشن حیدرآباد میں برسر خدمت ہیں۔ ملازمت کی طوق کے باوجود علمی تحقیق اور ادبی خدمات میں مشغول رہتے ہیں۔ دکن میں اردو۔ یورپ میں دکنی مخطوطات۔ مکتوبات امجد۔ حضرت امجد کی شاعری۔ خواتین عہد عثمانی۔ رہبر سفر یورپ وغیرہ ان کی تصنیفات ہیں۔ حضرت امجد کے بہت سے خطوط ہاشمی کے پاس محفوظ ہیں۔

ہم عصر شاعر حیدرآباد کا دل نواز اور شعر آفریں ماحول بیرونی شعراء کے لئے ہمیشہ سازگار رہا ہے۔ سلاطین دکن کی بے مثل فیاضانہ قدردانیوں کے باعث ہر زمانے میں باہر سے شعراء آتے رہے اور حیدرآبادی شعراء کے باہمی میل جول اور شاعروں کی شرکت سے محفل سخن کو گرماتے رہے چنانچہ امجد کی شاعری نے جس وقت زبان کھولی اُس وقت حیدرآباد میں غزل گو شعراء کا طوطی بول رہا تھا۔ متعدد اساتذہ اور امام فن حیدرآباد دکن میں موجود تھے مگر ان کو ہم امجد کے ہمعصروں میں شمار نہیں کرتے بلکہ اس دور کے اختتام پر جو لوگ آئے اور زمانہ حال تک رہے یا اس وقت موجود ہیں اُن کو صحیح معنوں میں ہم امجد کے ہمعصر کہہ سکتے ہیں۔ ذیل کی فہرست پر نظر ڈالنے کے بعد امجد کے زمانہ کی شعری فضا اور حیدرآباد کے ماحول کے متعلق صحیح اندازہ ذہن نشین ہوسکتا ہے اور اس وقت جب کہ دبستان شاعری کے متعدد اساتذہ اپنے کمال کا سکہ بٹھا چکے تھے ایسی حالت میں امجد کا ان اساتذہ کی صفوں کو چیرتے ہوئے آگے بڑھنا اور ایک سربرآوردہ شاعر بن کر چھا جانا واقعی بہت بڑی بات ہے۔ باہر سے جو شعراء حیدرآباد آئے اُن کے نام یہ ہیں۔

حیدر یار جنگ نظم طباطبائی۔ سید محمد ضامن کنتوری فصاحت جنگ جلیل مانک پوری۔ پروفیسر وحید الدین سلیم شبیر حسن خاں جوش۔ کاظم علی باغ۔ واجد حسین یگانہ عظمت اللہ خاں عظمت۔ شوکت علی خاں فانی وغیرہ۔ حیدرآبادی ہمعصر شاعروں میں حسب ذیل اسمائے گرامی ہیں۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر شاد۔ صفی اورنگ آبادی عزیز یار جنگ بہادر عزیز۔ تراب یار جنگ بہادر سعید۔ علی اختر وغیرہ۔

خطاب موجودہ ہندوستان میں دو تین ہی شاعر ایسے ہوں گے جن کو ان کی قابلیت کی بنا پر خطابات دئے گئے ہوں بعض شاعر اپنے نام کے آگے طرح طرح کے القاب لکھ لیتے ہیں یہ اکثر خود ساختہ ہوتے ہیں کسی نے کسی شاعر کو خطاب دیا بھی تو اس خطاب دینے والے کی شخصیت کا اندازہ بھی لگانا پڑتا ہے واقعی اس میں اتنی استعداد علمی ہے کہ وہ شعر وسخن کے جواہر کو پرکھ سکتا ہے اور تنقید کے آداب سے واقف ہے تو درحقیقت اس کا دیا ہوا خطاب اہمیت رکھے گا علامہ سلیمان ندوی کے تبحر علمی سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے آپ نے معارف فبروری ۱۹۳۳ء کے شذرات میں لکھا تھا کہ

"معارف کا یہ شیوہ نہیں کہ شاعروں کو خطاب بانٹے لیکن حضرت امجد کی پُرنور حکمت آموز شاعری نے اس کو اعتراف فضل پر مجبور کیا اور لفظ حکیم الشعراء سے واقعہ کا اظہار کیا۔"

علامہ سلیمان ندوی نے اپنی اس تحریر میں جو الفاظ استعمال کیے ہیں ان کی نشست خود بتلا رہی ہے کہ وہ ظاہری خوشامد نہیں کر رہے ہیں بلکہ ہر لفظ اُن کے دل کی آواز ہے۔

پروفیسر شیخ عطاء اللہ ایم۔ اے
شعبۂ معاشیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
کی نظر میں

اِدارۂ اِشاعتِ اُردو

حیدر آباد میں حال ہی میں "ادارۂ اشاعت اُردو" کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اِس اِدارہ کو **سید عبد القادر اینڈ سنز گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز مالکان اعظم اسٹیم پریس** حیدر آباد کے وسیع مالی ذرائع، شہرت اور تجربہ کے ساتھ ساتھ ایک اہل بصیرت و فراست اور صاحب عزم و ہمت گروہ کی قابلیت اور سرگرمی بھی حاصل ہے، اس طرح سرمایۂ علم اور کاروباری لیاقت و شہرت کا یہ نادر اجتماع اِدارہ کی کامیابی کا ضامن ہے اپنے قیام کی قلیل مدت کے اندر اندر ادارۂ اشاعت اردو نے جو بلند پایہ مطبوعات پیش کی ہیں وہ اِس کی علم دوستی، جوہر شناسی اور کاروباری سلیقہ کا نہایت دلآویز ثبوت ہیں۔ ادارہ نے حسب ذیل مطبوعات اُردو میگزین میں ریویو کے لئے اِرسال کی ہیں۔

(۱) مُردوں کی مسیحائی (۲) محمد علی (ذاتی ڈائری کے چند اوراق) (۳) مضامین عبد الماجد۔ یہ تینوں کتابیں مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی کے تصنیفات ہیں۔ جن کا اسم گرامی تصنیفات کی بلند پائیگی اور مضامین کی اسلامی و ملی نوعیت کا سرمایہ دار ہے۔ (۴) نغمات ماہر اور (۵) محسوساتِ ماہر (۶) جمہوریہ چین اور (۷) ڈا لی کونٹ سیموئیل کی ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ بہ عنوان "یقین و عمل" اِن کتابوں کے علاوہ بھی اِس ادارہ نے چند اور کتابیں شائع کی ہیں۔ مولانا عبد الماجد کے ایمان افروز خطبات اور ماہر کے روح پرور نغمات کی اشاعت ہندوستان کے ہر ادارۂ اِشاعت کے لئے باعث افتخار ہے۔ اس اطلاع سے مقصود کتابوں پر ریویو نہیں۔ کاغذ کی گرانی بلکہ نایابی کے زمانے میں جس ادارہ نے ظاہری و معنوی اعتبارات سے اس قدر بلند پایہ مطبوعات پیش کی ہیں حلقہ مسلم یونیورسٹی میں اس کا تعارف منظور ہے۔ اس کی ضرورت یوں بھی پیش آئی کہ اس ادارہ کے ناظم جناب **چودھری محمد اقبال سلیم صاحب گاہندری** نے ادارۂ اشاعت اُردو حیدر آباد اور اساتذہ مسلم یونیورسٹی کے درمیان اتحاد عمل کی دعوت دیتے ہوئے علی گڑھ میں زیرِ ترتیب تصنیفات کی اِشاعت پر آمادگی ظاہر فرمائی ہے۔ جن احباب کے پاس سودات برائے اشاعت موجود ہوں یا جو حضرات کسی تصنیف و تالیف کے آغاز سے پیشتر اِشاعت کے متعلق اطمینان چاہتے ہوں **چودھری صاحب** موصوف سے براہ راست خط و کتابت کریں۔ اِس زمانہ میں جب کاغذ نایاب ہو رہا ہے اِدارۂ اُردو کی یہ پیش کش مستحق ستائش و تعاون ہے۔ مجھے امید ہے کہ نہ صرف علی گڑھ بلکہ شمالی ہندوستان کا حلقۂ مصنفین اس تجویز کا پرجوش خیر مقدم اور عملی اعتراف کرے گا۔

منقول از کانفرنس گزٹ علی گڑھ۔
مورخہ یکم ستمبر ۱۹۴۳ء

ماہر القادری

محسوساتِ ماہر

کچھ اس ادا سے خونِ تمنا کیا گیا
جیسے مری طرف سے تقاضا کیا گیا

وہ زیست آہ جس پہ نگاہِ کرم ہوئی
وہ دردہائے! جس کا مداوا کیا گیا

اُتنے ہی وہ گرفتِ نظر سے تھے دُور دُور
جتنا قریب جا کے نظارا[1] کیا گیا

میں اپنی غم پرست طبیعت کو کیا کروں
جب خود ہوا نہ درد تو پیدا کیا گیا

وہ ہنس دئے کہ عرضِ تمنا فضول ہے
میں اس خیال میں کہ اشارا[2] کیا گیا

سچ تو یہ ہے کہ غم ہی محبت کی جان ہے
تیرے لئے خوشی کو گوارا کیا گیا

(تازہ ترین ناتمام)

[1] نظارہ۔ [2] اشارہ

اسرار

علی اختر کی نظموں کا پہلا مجموعہ

اختر کے یہاں شور و ہیجان ہنگامہ و تلاطم نہیں، لیکن صداقت کی گونج اور حقیقت کی بلند آہنگی ضرور پائی جاتی ہے اختر کی شاعری زہر آلود تلخی اور غیر سنجیدہ طنزیاتی رنگ سے بھی پاک ہے اور اسی لئے اس کے نصائح میں خاص کیفیت و دلکشی پائی جاتی ہے۔ اختر کی شاعری بےشک زبان کی شاعری نہیں اور نہ محض شگفتگی بیان کی، لیکن اس میں صداقت کا اتنا گہرا رنگ ہوتا ہے کہ ہم اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہ یقیناً اپنے آپکو انقلابی شاعر کہلانا پسند نہیں کرتا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انقلاب کی صحیح روح سب سے زیادہ اسی کے کلام میں پائی جاتی ہے جس کا تعلق سرمایہ و عمل کی سطح سے بہت بلند اس دنیا سے ہے جہاں بغیر انا الحق کہے ہوئے بھی انسان کو سولی پر چڑھا دیا جاتا ہے۔

(نیاز فتحپوری)

انگڑائیاں

انگڑائی میں صعود ہے، پرواز ہے، حسن ہے، پھیلاؤ ہے، رقص ہے، بیداری ہے، غنودگی ہے اور وہ سب کچھ ہے جسے زندگی کے صحیح عناصر کا مجموعہ قرار دیا جا سکے۔

انگڑائیاں

مرتبہ احمد ندیم قاسمی

اردو افسانہ نگاروں کی اس پرواز اور بیداری کا ایک بے مثل شاہکار ہے جس نے گذشتہ دس برس کے اندر مغربی ممالک تک کو مبہوت کر دیا۔ یہ مجموعہ ہندوستان کے پندرہ مشہور افسانہ نگاروں کے شاہکار افسانوں کا خوبصورت مجموعہ ہے ان افسانوں کو منتخب کرنے والا خود بھی افسانہ نگاروں کی اس نئی جماعت میں شامل ہے اسلئے اسکی نگاہ انتخاب کی صحت مسلم ہے اس مجموعہ میں عریاں ادب کو دخل ہے نہ بے محل تقریر بازی کو یہ افسانے زندگی کے اس ہیرے کے مختلف پہلو ہیں جسے اردو افسانہ نگاروں نے تراشا۔ ہر فن کار کی تراش کا طریق الگ ہے۔ لیکن انداز بیان کے حسن مشاہدہ کے کمال اور اسرار فطرت کی نقاب کشائی

کوثر چاند پوری

منزلِ مقصود

عابد، حسین بھی تھا، نوجوان اور تعلیم یافتہ بھی، مگر ان تینوں چیزوں میں اُس کی اقتصادی مشکلات کو حل کرنے کی قوت نہ تھی، وہ شوخ اور بذلہ سنج بھی تھا، لیکن زندگی کے مصائب نے اُن اوصاف کو بھی طبعی نہ رکھا تھا بلکہ آورد بنا دیا تھا، وہ کلکتہ کے ایک مشہور ہوٹل میں ملازم تھا، تنخواہ کم تھی کام بہت زیادہ تھا لکھنے پڑھنے اور حساب وکتاب کا سارا بوجھ عابد ہی کے سر تھا، منیجر نے اپنے فرائض کو صرف دستخط کرنے تک محدود کر دیا تھا عابد کو یہ ملازمت پسند تو نہ تھی البتہ بہت سی مجبوریوں نے جمع ہوکر گوارا بنا دیا تھا، اُس نے حال ہی میں ایک مقامی کالج سے بی۔ اے کیا تھا اور چند ماہ مختلف دفاتر اور سرکاری اداروں میں تلاشِ روزگار کی مہم میں ناکام رہ کر ہوٹل کی نوکری کو غنیمت سمجھکر قبول کر لیا تھا بلکہ سچ بات یہ ہے کہ نوکری نے اُسے قبول کر لیا تھا۔

عابد کالج کی زندگی میں ہمیشہ ممتاز اور ہر دلعزیز رہا وہ اپنی قابلِ رشک تندرستی اور جسمانی طاقت کے باعث کھیلوں میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کرتا اور دلچسپ اندازِ بیان، نیز ظریفانہ مگر مہذب گفتگو کی وجہ سے مجالس میں بھی رونقِ محفل بنا رہتا لیکن ملازمت کے متعلق جو اُمیدیں عرصہ سے اُس کے قلب و دماغ میں پرورش پا رہی تھیں اُن پر مایوسی کی اوس پڑتے ہی اُس کی طبیعت بجھ گئی تھی اب نہ اُس میں کوئی دلچسپی باقی رہی تھی نہ ظرافت اور شوخی، وہ صرف کلرک بن کر رہ گیا تھا اور دوات قلم کے علاوہ دنیا کی کسی چیز سے واسطہ نہ رہا تھا۔ پھر منیجر کی بد دماغی، سخت گیری اور خود غرضی نے اُسے بالکل ہی بیکار کر دیا تھا۔ جھڑکیاں کھانے اور حاکمانہ غصّہ کو برداشت کرنے کا وہ قطعاً عادی نہ تھا نہ یہ عادت پیدا کرنا چاہتا تھا اسی لئے اپنی چھٹی کے اوقات کا بھی زیادہ حصہ وہ ہوٹل کے کاموں میں صرف کرکے منیجر کی خفگی کے امکانات کو بالکل ہی معدوم کرنیکی کوشش کیا کرتا، اِس کوشش نے نہ تو اس کی رگوں میں حسن کی کوئی تڑپ باقی رکھی تھی اور نہ دل میں اتنی زندگی چھوڑی تھی کہ اس کی دھڑکنوں سے رگوں کو جگاتا رہے وہ روزآنہ ۸ بجے ہوٹل پہنچکر مصروف ہو جاتا اور شام کو ۵ بجے تک اپنے فرائض ادا کرتا رہتا اس پر بھی کاغذات کا ایک بستہ اُسے گھر لے جانا پڑتا اور رات کے دو تین گھنٹے مختلف کاغذات کی ترتیب وتکمیل میں صرف کرنا پڑتے دفتر کے اوقات میں اُسے رجسٹروں کی خانہ پری بھی کرنی پڑتی اور باہر کے کاموں میں بھی حصہ لینا پڑتا ایک دو مرتبہ بازار اور بنک جانا تو لازمی تھا ایک معمولی سی سائیکل اُسے دیدی گئی تھی، جس نے پیدل چلنے کی تکلیف سے نجات دیدی تھی ایک دن وہ حسبِ معمول ۵ بجے سے کچھ پہلے بنک پہونچا اور وہاں سے فارغ ہوکر چلنے کے ارادے سے اُس نے سائیکل اُٹھائی کہ اتنے میں ایک خوبصورت دوشیزہ نے اُس کے قریب آکر پوچھا کیا آپ یہیں ملازم ہیں؟

"جی نہیں، اُس نے بہت زیادہ مصروف آدمیوں کی طرح بے توجہی سے جواب دیا۔

"پھر کہاں ملازم ہیں آپ"؟

"ہوٹل میں"!

کیا کام کرتے ہیں آپ وہاں ؟

علاوہ کھانا پکانے نیز تناول کرنے اور برتن مانجھنے کے وہاں کے سب کام میرے ہی سپرد ہیں !

اس کے معنی یہ ہوئے کہ برتن مانجھنے اور کھانا پکانے کی جگہ ابھی آپ کے یہاں خالی ہے !

ہو کیا مطلب ہے آپ کا ؟ عابد نے دوشیزہ کی طرف پوری توجہ اور ہمدردی سے دیکھتے ہوئے پوچھا ' جس کے صباحت آفریں چہرے پر جگہ جگہ پسینہ کے قطرے تاروں کی طرح چمک رہے تھے اور دہکتے ہوئے گال 'گلاب کے تازہ حسین توڑے ہوئے پھولوں کی طرح پژمردہ ہونا شروع ہو گئے تھے ' بڑی بڑی دلفریب آنکھوں میں ہلکی سی نمی جھلک رہی تھی اور لمبی لمبی جگردوز پلکیں آنسوؤں کے پانی سے سیراب ہو کر دل میں خلش پیدا کر رہی تھیں ؛

میں بھی ملازمت کرنا چاہتی ہوں !

کیوں ؟

پیٹ بھرنے کے لئے ۔

اِس مقصد کے لئے تو صرف شادی بھی کافی ہو سکتی ہے

عابد نے ذرا مُسکرا کر کہا ' اِس وقت اس کے جذبات میں کچھ بیداری سی پیدا ہو گئی تھی ۔

معاف فرمائیے شادی سے صرف آرزوئیں سیراب ہو سکتی ہیں پیٹ نہیں بھر سکتا ۔

جی ہاں اِس لئے کہ آج کل کے شوہر بھی بی ۔ اے پاس کرنے کے بعد عرصہ تک بیکار ہی رہتے ہیں اور نوکر بھی ہوتے ہیں تو اتنی ہی تنخواہ ملتی ہے کہ سارے خاندان کو بھوکا مار کر اپنا پیٹ بھر لیں ' اور اکثر تو شادی یا ملازمت کرنے سے قبل ہی خودکشی کر لیا کرتے ہیں ؛

وجہ کچھ بھی ہو ' میں نوکری کے سلسلہ میں آپ سے اِمداد چاہتی ہوں ؛

میں تو خود دو مہینے پہلے تک اِس امداد کا مستحق تھا ۔

تو آپ میری اعانت نہیں کر سکتے ؟

کر سکتا ہوں مگر صرف اِتنی کہ اپنے ہوٹل کا راستہ آپ کو بتا دوں اور وہاں پہونچکر منیجر کے کمرے تک آپ کی رہبری کر دوں اِس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتا ۔

یہ اُمید تو آپ دلا سکتے ہیں کہ مجھے ہوٹل میں نوکری مل جائے گی ۔

روٹی تو اُس وقت وہاں یقیناً مل سکیگی ' نوکری کے متعلق میں زیادہ متوقع نہیں کر سکتا ' بہر کیف آپ میرے ساتھ چل سکتی ہیں "

(۲)

عابد کو ہوٹل پہونچتے ہی معلوم ہوا کہ منیجر صاحب چند بار گھنٹی بجا چکے ہیں ' وہ اتنی دیر تک واپس نہ آنے کی بنا پر سخت برہم تھے اور کسی ضروری کام سے جلد آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں وہ بڑے ادب سے منیجر کے کمرے کی چک اُٹھا کر میز کے سامنے جا کھڑا ہوا ' منیجر خاموش بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا عابد کو دیکھتے ہی اس نے پوچھا ' عابد تم نجمہ کو جانتے ہو ؟

نہیں جناب میں بالکل نہیں جانتا ! ۔ لیکن ذرا ٹھہریئے آپ کسی عورت کے متعلق دریافت فرماتے ہیں یا فلم کے متعلق ؛

میں اس نجمہ کے متعلق پوچھتا ہوں ' جانتے ہیں آپ اُنھیں ؟

بالکل نہیں ! - - - - کلکتہ کی موجودہ زندگی میں میرے پاس اتنا وقت ہی نہیں کہ میں کسی سے تعارف پیدا کر سکوں ۔

عابد غلط گوئی سے کام نہ لو نجمہ نے ابھی ابھی مجھ سے کہا ہے ۔ تم اُسے جانتے ہو ۔

یہ بھی تو ممکن ہے اس نے غلط گوئی سے کام لیا ہو ' اور اگر آپ کی رائے میں وہ جھوٹ نہیں کہہ سکتی تو ممکن ہے وہ مجھے جانتی ہو ۔

اچھا میں ابھی اُسے بلاتا ہوں ۔

گھنٹی بجاتے ہی دوسرے دروازے سے نجمہ داخل ہوئی، اُس کا چہرہ اُمید اور ندامت کے جذبات سے تمتمایا ہوا تھا، اُس نے آتے ہی عابد کو دیکھا، اور بلند آواز سے پوچھا کیا آپ مجھے نہیں جانتے؟

میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں، عابد جلدی سے بول اُٹھا۔

تم نے ابھی ابھی تو کہا تھا، تم نجمہ کو نہیں جانتے:

میں اُن کا نام نہ جانتا تھا اُنھیں خوب جانتا ہوں، بلکہ سفارش کرتا ہوں کہ آپ کے یہاں کوئی جگہ ہو تو اُنھیں ضرور ملازم رکھ لیجئے۔

مشکل یہ ہے کہ میں تیس روپیہ سے زیادہ کی اِس وقت کوئی جگہ نہیں دے سکتا۔

میں اس تنخواہ پر کام کرنے کو تیار ہوں، نجمہ نے جلدی سے کہا۔

(۳)

نجمہ تعلیم یافتہ تھی مگر جو کام اس کی سپرد کیا گیا تھا اُس کا اُسے بالکل تجربہ نہ تھا۔ شروع میں اُسے کافی دشواریاں پیش آئیں لیکن عابد کی امداد ہر مرحلہ پر اس کی دستگیری کرتی رہی رفتہ رفتہ نجمہ کو اِتنا سلیقہ ہو گیا کہ وہ عابد کی اِمداد کے بغیر ہی اپنے فرائض انجام دینے لگی۔

نجمہ اور عابد دونوں دفتر کے اوقات میں ساتھ رہتے شام کو اپنے اپنے گھر چلے جاتے، ایک دوسرے سے جدا ہو کر دونوں کو تنہائی کی تکلیف محسوس ہوتی، نجمہ دل میں سوچتی عابد ساتھ نہیں اور عابد سوچتا نجمہ نہیں، رات بھر بے چینی سی رہتی اور ہوٹل میں آکر معلوم ہوتا کہ تنہائی کی اذیت باقی نہیں رہی، —— آنکھیں اِحساسات کی ترجمانی کرتیں، دل کو محسوس ہوتا کہ وہ کوئی پیام لا رہی ہیں مگر زبانیں خاموش تھیں اُن میں اپنا کام کرنے کی جرات موجود نہ تھی، —— دِلوں میں مناسب تدریج کے ساتھ ایک قسم کی آگ سلگ رہی تھی جس کا دھواں ابھی وہیں گھٹ رہا تھا:

ایک دن نجمہ نے پُوچھا گھر جا کر آپ کیا کرتے ہیں؟

صرف آرام!

حالانکہ دماغی مصروفیت کے بعد تفریح نہایت ضروری ہے۔

یقیناً ضروری ہے مگر میں اِس کا مفہوم دریا کے کنارے یا کسی سبزہ زار میں ٹہلنے تک محدود نہیں سمجھتا، تنہائی میں تصورات کی طاقت سے اگر دماغ سبزہ زار بن جائے تو باغات میں جا کر تفریح کرنے کی ضرورت نہیں رہتی، پھر تھک جانے کے بعد آرام ہی سب سے بڑی تفریح ہے —— ہاں مگر یہ باتیں نصیب کہاں ہوتی ہیں، نجمہ نے عابد کی شرماتی ہوئی آنکھوں میں جذبات کے کچھ دھندلے سے خاکے محسوس کرتے ہوئے کہا۔

جنھیں نصیب نہیں ہوتیں وہ آزاد ہیں، چلیں پھریں اور اپنی طبیعت بہلائیں!

منیجر صاحب روزانہ شہر سے باہر چلے جاتے ہیں کل کہہ رہے تھے تندرستی کے لئے تازہ ہوا بہت ضروری ہے۔

اُنھوں نے غلط نہیں کہا نجمہ کاش وہ تمھیں تازہ ہوا حاصل کرنے کی سہولتیں بھی بہم پہونچایا کریں۔

اِس کے لئے بھی وہ تیار ہیں اُنھوں نے چند بار مجھ سے کہا کہ موٹر میں میں تنہا جاتا ہوں تم پسند کرو تو میرے ساتھ چل سکتی ہو،

عابد منیجر کی نخوت اور اُس کی رعونت آمیز حاکمانہ روش سے واقف تھا اُس نے نجمہ کی زبان سے یہ الفاظ سنتے ہی اپنے دل میں ایک چبھن سی محسوس کی اُس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی جھڑیں اور رگوں میں ایک آگ پھیلتی ہوئی معلوم ہوئی وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ سکا۔

خاموش کیوں ہو گئے عابد صاحب کیا آپ بھی چلنا چاہتے ہیں منیجر صاحب کے ساتھ؟

نہیں ہرگز نہیں —— وہ بہت مغرور آدمی ہیں!

بالکل نہیں عابد صاحب، میں آپ کے اِس تبصرے سے متفق نہیں منیجر صاحب بہت خوش اخلاق اور سنجیدہ اِنسان ہیں!

غرور تو اُنھیں نام کو نہیں۔

ممکن ہے نجمہ تم نے اُن میں یہ اوصاف پیدا کر دئیے ہوں!

گریہ فطری ہوا کرتے ہیں!

تم فطرت بھی بدل سکتی ہو۔

آپ میری اِس قوت پر یقین رکھتے ہوں تو مجھے اپنے اُوپر تجربہ کرنے کا موقعہ دیجئے۔

آپ کو ہر وقت اس تجربہ کا موقعہ حاصل ہے!

(۴)

نجمہ دفتر سے اُٹھتے ہی منیجر کے ساتھ تفریح کو چلی جاتی اور عابد اپنے سینہ کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں مصروف گھر چلا آتا، تھوڑے ہی دنوں میں نجمہ اور منیجر میں کافی مراسم ہو گئے، منیجر نے اس کے مقابلہ ہی وہ خودداری بھی ترک کر دی جو دوسرے ملازموں کے ساتھ برتنے کا عادی تھا، اِس ارتباط کے نتائج عابد کے سامنے تھے اسی لئے وہ آہستہ آہستہ نجمہ سے الگ رہنے کی کوشش کر رہا تھا اب اُسے اپنے اور نجمہ کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج نظر آتی تھی، لیکن نجمہ کے طرزِ عمل میں کوئی فرق نہ آیا تھا وہ بدستور عابد کے پاس آتی، دیر تک اُس سے باتیں کرتی، اور اپنے متعلق مشورے لیتی؛ ——— ایک دن نجمہ نے عابد سے سوال کیا، عورت کو ازدواج کے معاملہ میں کن امور پر سب سے زیادہ زور دینا چاہیئے؟

میری رائے میں اِس مسئلہ کا بہترین حل دولتمندی ہے، عورت کو سب سے پہلے دولت و امارت پر نظر کرنی چاہیئے، پھر تندرستی، عمر اور حسن صورت پر، اور سب سے آخر میں اخلاق و عادات پر۔

ابھی تک شادی کا منشا آپ کے نزدیک صرف شکم پُری ہے، جیسا کہ پہلے دن آپ نے کہا تھا، آرزوؤں کی تشنگی غالباً آپ کے خیال میں کچھ اہمیت نہیں رکھتی؛

میری رائے میں دولت ہر جذبہ کو سیراب کر سکتی ہے، یہ طاقت تو میرے عقیدہ میں صرف موت کو حاصل ہے

ممکن ہے آپ کا خیال صحیح ہو میری رائے یہ ہے کہ غرباء کے جذبات صرف موت سے اور امراء کے دولت سے سیر ہو جایا کرتے ہیں۔

اور مردوں کو ازدواج کے سلسلہ میں آپ کیا مشورہ دیتے ہیں۔

مرد کی حسبِ منشاء شادی میں سب سے بڑی معاون چیز موٹر ہے اور یہ بھی دولت کے تابع ہے، اس لئے حسن اور جوانی کو دوسرا درجہ دیا جا سکتا ہے!

خود اپنی ذات کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

فی الحال تو میں امارت کے مقابلہ میں غربت سے زیادہ قریب ہو رہا ہوں میرا ارادہ ترک ملازمت کر کے باہر جانے کا ہے، ایسی صورت میں اپنی ذات کے بارے میں کوئی نظریہ قائم نہیں کر سکتا۔

آپ ایسا خطرناک اقدام کیوں کر رہے ہیں؟

اب میں کوئی اور کام کر دوں گا، ملازمت سے میری طبیعت اکتا گئی۔

اور باہر جانے میں کیا مصلحت ہے کام تو یہاں بھی کیا جا سکتا ہے!

یہاں کی آب و ہوا مجھے موافق نہیں!

پھر کہاں جانے کا مقصد ہے؟

یہ ابھی میں بتا سکتا۔

اگر آپ بتا سکتے تو ممکن تھا میں بھی ساتھ دیتی!

مجھے آپ کے ساتھ کی ضرورت نہیں اور اگر آپ یہ ایثار کرنا چاہیں گی تو میں منیجر صاحب کی خاطر آپ کو روکنے کی کوشش کروں گا۔

منیجر صاحب کی خاطر! ——— عابد صاحب میں اس غلط فہمی کو رفع کرنا چاہتی ہوں، سنئے

نجمہ مجھے کوئی غلط فہمی نہیں تفصیلات میرے لئے اکثر ناگوار ہوا کرتی ہیں میں تمہارے اور منیجر صاحب کے متعلق ایک لفظ نہیں سننا چاہتا، دیکھو میرا وقت خراب کرو۔

چاہے آپ میرا دماغ خراب کر دیں۔

نجمہ اور عابد دونوں خاموش ہو گئے، ——

نجمہ کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے، وہ غصّے سے کانپ رہی تھی؛

(۵)

اگلے دن ہوڑہ ایکسپریس سے عابد کی روانگی تھی وہ ٹھیک وقت پر اسٹیشن پہونچ گیا اور اپنا سامان گاڑی میں رکھکر ٹہلنے لگا گاڑی چھوٹنے میں چند ہی منٹ باقی تھے کہ نجمہ بھی آگئی اور بڑے پُرجوش انداز سے عابد سے ملی؛

آپ نے کیوں تکلیف کی؟

آپ کو پہونچانے چلی آئی تھی اور مجھے یہ بھی معلوم کرنا تھا آپ جا کہاں رہے ہیں آپ کا پتہ کیا ہوگا؟

نجمہ یہ تو مجھے خود نہیں معلوم میں کہاں جا رہا ہوں اور میرا پتہ کیا ہوگا؟

آخر کوئی منزلِ مقصود تو آپ نے ضرور متعین کی ہو گی۔ نجمہ طوفان انگیز دریا میں کشتی ڈال کر اُس کی بڑی بڑی موجوں کو دیکھنے کے بعد یہ سمجھنا کہ ہماری کشتی ساحل سے جا لگے گی یقیناً بے وقوفی ہے ؛ —— میں ایسے سمندر میں کشتی ڈال رہا ہوں، جس کا کوئی کنارا نہیں !۔

مگر ریل میں بیٹھکر یہ سوچنا کہ ہم نے جہاں کا ٹکٹ لیا ہے وہاں نہ پہونچینگے اِس سے بڑی بے وقوفی ہے؛

محض ٹکٹ خرید لینا منزلِ مقصود کو متعین نہیں کرتا۔ نجمہ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں ساحل کی تلاش میں روانہ نہیں ہوا، جو شخص ساحل سے اُکتا کر دریا کی موجوں سے محبت کرنے لگے ظاہر ہے کہ وہ ہمیشہ یوں ہی بہتا رہے گا؛

آپ تو ریل میں سوار ہوتے ہیں کسی دریا میں نہیں کودتے؛

شاید تم نے دریا کا مفہوم ہی غلط سمجھا، خیر میرا دریا یہی ہے، جب مطلب سر پھوٹنے سے ہو تو کسی خاص قسم کے پتھر کی جستجو فضول ہے، میں آوارگی چاہتا ہوں اب چاہے وہ ہوا میں میسر ہو یا پانی میں۔

میں بھی آپ کا ساتھ دونگی؛

تباہی میں ساتھی کی ضرورت نہیں

پھر ہم دونوں الگ الگ تباہ ہو جائیں گے؛

نجمہ غالباً تمہیں منیجر صاحب کی تکلیف کا احساس نہیں رہا؛

یہ احساس کبھی میرے دل میں پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ لیکن تمہاری موجودگی سے اُنھیں بڑا سکون تھا؛

میری رائے میں اب میری عدم موجودگی میں اُنھیں سکون حاصل ہوسکیگا۔

یہ کیونکر؟

اتنے میں انجن نے سیٹی دی اور دونوں کھڑکی کھول کر بیٹھے گئے، گاڑی بتدریج تیز پھر تیز تر ہو گئی؛ کلکتہ کی عمارات نگاہوں سے یوں اوجھل ہونے لگیں جیسے حافظہ سے بچپن کے واقعات آہستہ آہستہ محو ہو جایا کرتے ہیں، —— کلکتہ اور اُس کا تصور ریل کے چرخ کھاتے ہوئے دہویں میں دھندلا ہوتا جا رہا تھا اور جس قدر کلکتہ دُور ہوتا جا رہا تھا عابد اور نجمہ اتنے ہی قریب آتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے، عابد بندھے ہوئے بستر پر کہنی ٹیکے ہوئے بیٹھا تھا، نجمہ بغیر کسی سہارے کے بیٹھی ہوئی تھی اور تیز و تند ہوائیں اُس کے بالوں کو بار بار چہرے پر پھیلا دیتی تھیں، عابد نے پوچھا نجمہ تم کچھ کہہ رہی تھیں۔

ہاں میں یہ کہہ رہی تھی کہ میری موجودگی سے منیجر صاحب کو بڑی تکلیف تھی؛

کیوں؟ —— تمہاری ذات سے اُن کی بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔

میں نے اُن کی توقعات کو اِسی ہفتہ دوسری بار نہایت حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ

منیجر صاحب نے کالج کی زندگی میں بھی ایک بار مجھ سے استدعاء کی تھی جسے میں نے منظور نہیں کیا تھا، ہوٹل میں دفعتہً میرا ان کا سامنا ہوا، اُنھوں نے مجھے اور میں نے اُنھیں پہچان لیا، لیکن میں ضرورت سے مجبور تھی نوکری میرے لئے لازمی تھی، غالباً اُنھوں نے میری ضرورت مندی کو غنیمت سمجھا، اور پھر اپنی التجاء پیش کی، میں نے اُسے بھی ٹھکرا دیا، میں نے شادی کا مفہوم صرف آرزوؤں کی آسودگی کو قرار دیا ہے اگر یہ مقصد حاصل نہ ہو تو اس میں اور جیل کی زندگی میں ذرا بھی فرق نہیں کیا جا سکتا، ——

پھر اب ہمیں اپنی منزل مقصود متعین کر لینی چاہیئے!

نہیں، اب کچھ نہ سوچیئے محبت جہاں لے چلے وہیں چلے چلئے!

محبت! — — — کیا تم بھی اس کی کارفرمائیوں پر کچھ اعتقاد رکھتی ہو نجمہ؟

کچھ نہیں بہت زیادہ!

مگر مجھ سے زیادہ نہیں!

دفعتہً ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر کھڑی ہوئی مال گاڑی سے ایکسپریس ٹکرایا، بڑے زور کا دھاکہ ہوا۔ شور و غوغا، آہ و بکا، اور نالہ و شیون کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا:

چند گھنٹے کے بعد طبی امداد کے لئے ایک جماعت آئی اور زخمیوں کو لے کر چلی گئی، ——— لاشیں یہیں پڑی رہیں، ———

عابد اور نجمہ اپنی غیر متعین منزل مقصود "پر پہونچ گئے تھے، معلوم نہیں محبت کی کارفرمائیوں پر دونوں میں سے کس کا اعتقاد زیادہ تھا: — — —

قطعہ

[illegible]

دل کی بے تابیاں کہہ نہ سکا

[illegible]

[illegible]

[illegible]

"سنسار"

یہ تمدن کے خرافات کا فرسودہ نظام

یہ حسینوں کے ہجوم اور سمنٹ کی سڑکیں

موٹروں، بگیوں، ٹانگوں کی ٹریفک سے تپاں

دولتِ و عیش کے ایوان

غریبوں کا لہو

(۲)

موت کی سیج پہ مزدور کی دلہن کا کفن

تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں پہ فلاکت کا جہیز

پان و مسّی کے سوا کچھ بھی نہیں کچھ بھی نہیں

جھونپڑی قبر کا تاریک خطرناک سا غار

جسمیں صوفے، نہ تپائی نہ کوئی کرسی و میز

بھینس کی ایک سڑی لاش کے پہلو میں گدھا

مرثیہ خوانِ حیات!!

(۳)

سینۂ جہل میں، مجہول عبادت کا فریب

ذہنِ آزاد پہ اک بوجھ

ہمالہ کی طرح!!

(۴)

ماضی و حال کے دوراہے پر

اک کلب!!

جس میں مے و نغمہ و مستی و گناہ

نفس کے ہاتھ میں رنگین گناہوں کا چراغ

یعنی تہذیب کے کتوں کی پناگاہ وہ گھر

معصیت کوش، جہنم بردوش!!

اس میں مزدور کی دنیا کے خدا

اور کسانوں کے رسول

پالتے ہیں مئے گلفام سے عیاش دماغ

"پاگل"

جہاں بانو بیگم نقوی

ایک خط

شہانہ!

اپنے دلچسپ خط کا شکریہ قبول کرنا

ادھر مجھے مسلسل کام۔ بے مصرف سی مصروفیتیں۔ دل تو چاہتا ہے تمہیں خوب طول طویل خطوط لکھوں۔ لیکن اِس نوعیت کا سکون نصیب نہیں ہوتا۔ ایک طویل سانس بھی تو لینے کی فرصت نہیں ملتی۔ نہ وہ دل ہی رہا نہ وہ دماغ ہی پہلے خط لکھنا ایک مسرت بخش مشغلہ تھا۔ ایک خوش آئیندسی تفریح تھی۔ اب تو زندگی ایک مسلسل بے کیفی کا نام ہے۔ جس میں دن اور رات کا بھی امتیاز مٹ گیا۔ یہ اِمتیاز کا مٹ جانا کتنا اچھا ہوتا ہے۔ تم کیا جانو اس کی لذتوں کو ـــ میرے خیال میں نجانے تو ہی اچھا ہے۔ اُہنہ۔ جانے دو جی۔ اِن سب جذبات کا اعادہ زندگی کی گوناگوں مجبوریوں میں لاحاصل بلکہ طفلانہ سی حرکت ہے۔ بتاؤ۔ اور کیا لکھوں۔ اپنی روداد زندگی؟ حقیقت یہ ہے کہ میں بہت جلد زندگی سے تھک گئی۔ اُس کی ان تھکا دینے والی روایتیں بعض وقت تو اس کی ناگزیر سی یکسانیت۔ کبھی اُس کی غیر شاعرانہ جدتیں۔ یہ ایک ہی طرح کے دن اور ایک ہی قسم کی راتیں۔ زندگی صرف لمحات ہی کے گزرنے کا نام ہو گیا ہے۔ وہ کیونکر گزرتے ہیں اس سے زندگی کو کوئی تعلق نہیں۔ یعنی زندگی اور عمر ہم معنی ہو گئے ہیں۔ جگر کے ایک شعر کو ذرا سا بدل دوں تو کیا ہو جائے ہائے کیا چیز ہے یہ تکملہ" ہوش و حواس"

اپنی صورت سے بھی اب ہم کو حیا آتی ہے

تم جیسے سطحی لوگ اِس" ہوش و حواس کے تکملہ" کی بلندی کو نہیں پہنچ سکتے۔ گہرائیوں میں جانے سے زندگی کے سربستہ اسرار معلوم ہوتے ہیں۔ تم کیا جانو اِس کیفیت کو لیکن پھر خیال آتا ہے۔ وہ بیہوشی کتنی اچھی تھی۔ کسی بات کی فکر نہ تھی۔ لاکھ جھڑکیاں سنتے اور پھر وہی کام کر گزرتے۔ دھتکارے جاتے اور پھر وہیں جاتے جہاں گالیاں پڑی تھیں نہ مار کی پرواہ تھی نہ جھڑکیوں کا احساس۔ اب تو ناک پر مکھی بیٹھنا مشکل ہے۔ کسی نے ذرا ٹیڑھی نظر سے دیکھا اور جی برا برا ہونے لگا۔ اچھی بات بھی بے تکی ہوئی تو سہی نہیں جاتی۔ بری تو بری ہے۔ احساسات کا بہاؤ اپنی تیز رَوانی میں سب کو بہائے جاتا ہے۔ کسی سے بات کرنے کو طبیعت نہیں چاہتی۔ اپنی کسی بات کا جواب نہیں ملتا تو دل ہتے سے اُکھڑ جاتا ہے۔ کسی کی تیکھی نظریں سہی نہیں جاتیں۔ بے حس اِنسانوں سے طبیعت گھبرانے لگی ہے۔ "احسان" سے متعلق نجانے تمہارا کیا تخیل ہے۔ بعض طبیعتیں ہوتی ہیں کہ اُنھیں احسان کرنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔ اِحسان لینے میں نہیں۔ اِحسان ـــ اُف۔ جب کوئی کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گھڑوں پانی پڑ گیا۔ پھر اُس کے مقابل سر نہیں اُٹھتا۔ کوئی مروت سے پیش آتا ہے تو اُس کا یہ طرزِ عمل غیر ضروری اور اجنبی۔ اجنبی سا محسوس ہونے لگتا ہے۔ یعنی یہ کہ بات کیا ہے۔ اِس بے پناہ مروت کا بھلا یہ کون موقع تھا۔ آخر یہ سب کیوں؟ کس لئے کیا فرض تھا۔ کیسی عجیب سی نوازشیں ہیں۔ کتنی غیر دلچسپ سی حرکتیں ہیں۔ ناممکن۔ غیر یقینی۔ غیر قیاسی۔ جھوٹ۔ فریب۔ دھوکا۔ اِس نرمی کے پیچھے نجانے کونسا شکار انہیں کھیلنا ہے۔ پتہ نہیں۔ اِس کے پس منظر میں وہ کونسا حسین فریب چھپا ہوا ہے۔ یا یہ کہ یہ تو اِنسان نہیں لگتے۔ کوئی

دیوتا ہیں۔ پھر یہ غیر ارضی حرکت کیسی؟ اپنے بھی تو اپنے نہیں ہوتے۔ غرض شہانہ۔ اِسی قسم کے خیالات دماغ کو پراگندہ کر دیتے ہیں۔ سوالات کا تخیل میں ایک تسلسل سا بندھ جاتا ہے اور سچ پوچھو تو دل میں ان مراعات کے قبولیت کی نہ صلاحیت ہے نہ سمائی ایک بے نیازی سی ہو چلی ہے۔ دنیا کی ہر چیز سے دل بھر گیا ہے۔ یہ تمہاری سماج! اِس کے ڈھکوسلے تو ایک آنکھ نہیں بھلتے۔ جس سے ملنا طبیعت نہیں چاہتی، اس سے دکھا دیکھی شرما حضوری، کیوں لوگ ملنے پر مجبور رہیں۔ جس سے ملنا فرض ہے اس سے کیوں کتراتے ہیں۔ بلا وجہ کی دشمنیاں۔ غیر متوقع دوستی۔ ظاہر داریوں کی طوفان بے تمیزی۔ یہ ثروت ونخوت کے دھندلکے میں لپٹی ہوئی دنیا ——— !!

" ہم بھی کچھ ہیں" ——— یہ میں پن۔ یہ خود پرستی۔ یہ شان ——— سچ سچ اگر کہہ دوں تو کیا بُرا ہے ——— صرف "ایک" ہی کے شایان شان ہے۔ ہمارے تمہارے جیسے انسانوں کے لئے ——— ہم کو اعزاز ملجاتا ہے۔ تو ہم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ تو کیا ہم اس سے زیادہ ہی کے مستحق تھے ہماری قدر نہیں کی گئی۔ اِس رتبۂ بلند کے تو ہم پیدائشی حقدار تھے سچے موتی کی پرکھ جوہری کو ہوتی ہے۔ غرض ہم کیا نہیں کہتے آئے دن۔ نجانے ہم خود کو کیا سمجھے ہوئے ہیں۔ اپنے پہچاننے میں ہم کتنی غلطی کرتے ہیں۔ خود سے اتنے قریب رہکر بھی جب ہم میں "خود شناسی" کی صلاحیت نہیں تو اوروں کو کیا خاک پہچان سکیں ——— نہ احساس کمتری اچھا۔ کہ سب سے خود کو ذلیل تصور کرنے لگیں۔ نہ احساس برتری ہی زیب دیتا ہے۔ غرض زندگی کی نفسیات بڑی ٹیڑھی ہے۔ لیکن اِس الجھی ہوئی ڈور کے بس دو ہی سرے ہیں۔ ہم اِس الجھاؤ کو سمجھنے سے معذور رہیں۔ یہ ہماری نظر کا دھوکہ ہے کہ اس ایک ہی الجھن کو بے گنتی دھاگوں کا الجھاؤ سمجھ لئے ہیں۔

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم ——— ہم اپنے راستے سے بھٹک گئے ہیں۔ قطرہ اگر دریا سے الگ ہو کر، اپنی اصلیت کو بھول جائے۔ اپنے سرچشمہ سے بھٹک جائے تو اس کا کیا علاج - جس قطرہ میں موتی بننے کی اہلیت نہیں وہ آنسو بن کر آنکھوں سے نہ گرے تو پھر کیا رہا اُسکی ہستی کا مقصد ———؟

یہ ذرا اونچی اونچی باتیں ہیں۔ سمجھ میں نہ آئیں تو پوچھ لینا۔ ذرا اور وضاحت سے بتا دوں گی۔ فقط

——— تمہاری ریحانہ

خورشید احمد جامی

اَے دُوست

پھر اُسی بدنام چورا ہے پہ آکر بار بار
بڑ کے سائے میں کروں اَے دوست تیرا انتظار

ہر نفس میں عشق و اُلفت کی کہانی ہو وہی
زندگی کی تلخیوں سے بدگمانی ہو وہی

تار کے کھمبے سے لگ کر دلنشیں باتیں کریں
شب کے سناٹے میں چھپ چھپکر ملاقاتیں کریں

میری گردن میں پڑی ہوں کیف زا بانہوں کے ہار
نکہتوں کی گود میں سو جائے تاروں کا خمار

زندگی کے ساز میں رقصیدہ نغماتِ حسیں
ہر تمنا مضطرب ہر آرزو کیف آفریں

چاندنی راتوں سے جا کر چھین لائیں مستیاں
یوں بسائیں خواب آلودہ نشیلی بستیاں

دل کی ہر دھڑکن بنے شعر و ادب کا ارتعاش
بہکی بہکی سی فضاؤں میں ہو نغموں کی تلاش

نیند آجائے پیامِ آرزو کہتے ہوئے
نرم رو موسیقیوں کی دھار پر بہتے ہوئے

مختصر یہ ہے کہ پھر بدنام ہو جائیں کہیں
شوق کی بھولی ہوئی راہوں میں کھو جائیں کہیں

آکہ پھر اِکبار وہ جامِ محبت پی سکیں
اِس غلام آباد میں کچھ روز شاید جی سکیں

قدوس صہبائی، بی۔اے (آنرز)

غصّے کی گھڑی

عبدالعزیز کو جج نے کل دو مہینے کی سزا دی حالانکہ اس پر قتل عمد کا الزام تھا۔ اس نے اپنی ماں کو مار ڈالا تھا ——— جب وہ جیل میں داخل ہوا تو نئے قیدی کا پرانے قیدیوں نے معمول کے مطابق استقبال کیا ——— گالیاں ——— قہقہے ——— آوازے۔ اس نے حیرت سے سب کچھ سنا لیکن اسے کیا خبر تھی کہ یہ جیل کی رسم کہن ہے۔ وہ ہکا بکا ایک کونے میں اس طرح دبک کر بیٹھ گیا جیسے کوئی اجنبی کتا کسی محلے میں آ نکلے اور محلے کے تمام دوست اور ساتھی کتے اس پر یلغار کر دیں اور وہ دُم دبا کر نہ بھاگ سکنے کے قابل رہے نہ لڑ سکنے کے ——— قیدیوں کی یورش اور بیڑیوں کی جھنکار سے ہراساں چاروں سمت آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر وہ دیکھ رہا تھا لیکن اسے ہر چیز پر یہ الفاظ لکھے نظر آتے کہ ——— "بچا ذرا ٹھیر تو جا! دیکھ ہم سب تیری کیا گت بناتے ہیں ———" اگرچہ وہ طبعاً تھا نہایت نرم مزاج کبھی نہ جھگڑنے والا اور سلیم الطبع انسان ——— تعلیم یافتہ شہری

قیدی افسر یا "سربراہی" نے دوسرے قیدیوں کی ڈانٹ ڈپٹ کر اس یورش کو روکا اور نئے قیدی کو بلا کر ہدایتیں کیں کہ اسے کس طرح جیل کی زندگی گزارنا ہے۔ لمبی سزاؤں کی میعاد گزارنے والے قیدیوں کے ساتھ اسے رکھا نہیں جا سکتا تھا کیونکہ ان کی نظر میں چھوٹی چھوٹی میعادی سزاؤں کے قیدی انتہائی تحقیر کے مستحق ہوتے ہیں جیل کے اندر اخلاقی جرائم کے قیدیوں کا فخر و امتیاز صرف ان کی سزاؤں کی طوالت اور ان کی جسمانی طاقت یا جرم کے کارناموں سے کیا جاتا ہے۔ جس طرح ڈاکو، قاتل، اور جسیم انسان سب سے زیادہ باعزت قیدی سمجھے جاتے ہیں اسی طرح کم میعاد کے قیدی، کمزور اور نحیف آدمی اور عورت کے قاتلوں کو سخت ذلیل اور بزدل شمار کیا جاتا ہے ——— عبدالعزیز کسی عزت کا قیدیوں میں مستحق نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود وہ تھا شریف خاندان اور لکھا پڑھا آدمی ——— جیل کے افسروں نے عبدالعزیز کی پوزیشن کو سمجھ لیا تھا۔ اور اس آزمائش سے بچانے کے لئے جس سے اس کو عام اخلاقی قیدیوں کے ساتھ رہ کر گزارنا پڑتا اس پر یہ نوازش اور مہربانی کی گئی کہ اسے سیاسی قیدیوں کی بارک میں کام کاج کے لئے بھیج دیا گیا۔ وہاں اسے کسی بے عزتی، کسی ذہنی تکلیف کا ڈر نہ تھا۔

جیل میں بعض باتیں ہر قسم کے قیدیوں میں مشترک ہو جاتی۔ بالخصوص ایک قیدی کی نفسی کیفیتوں میں عام طور پر یہ جذبہ بیدار ملیگا کہ وہ جلد از جلد رہائی پائے ——— یکسانی شاید جیل کی زندگی کا خاصہ ہے۔ کوئی قیدی ایسا نہ ملے گا جس کی نگاہیں اپنے گرد و پیش کی۔ چھوٹی بڑی چیز سے خوب مانوس نہ ہو گئی ہوں۔ یہ قیدی اپنے سامنے بہنے والے درختوں کی روزانہ نشو و نما کو ذہن میں محفوظ رکھنے پر مجبور رہے۔ پھول، پھل اور کلیوں کی تعداد اور ان کی تبدیلی اس کی نظر میں رہتی ہے۔ جن قیدیوں کو بند کوٹھریوں

سے باہر رہنے کی رعایت حاصل ہوتی ہے ناممکن ہے کہ وہ روزانہ آسمان پر گزرنے والے ستاروں کی گردش پر نگاہ نہ رکھتے ہوں ——— موسموں کے تغیر کا صحیح دن اُنھیں یاد رہتا ہے ——— دیواروں اور درختوں کے سائے سے وہ وقت کا صحیح اندازہ کرتے ہیں ——— ... جیل کے اندر رہنے والے اور آنے جانے والے پرندوں سے رفتہ رفتہ مانوس ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ اپنی بارکوں اور کوٹھریوں میں چیونٹیوں کی حرکات و سکنات پر بھی اُن کی نگاہ رہتی ہے۔ اور وہ اُن کی عادت سے واقف ہو جاتے ہیں ——— ... تحقیق و جستجو ——— یہ ہے خلاصہ اس ذہنی تربیت کا جو مجرمانہ ذہنیتوں پر مجرمانہ جلا کر دیتی ہے اور اچھے دماغوں کو اور زیادہ دور رس اور باریک بیں بنا دیتی ہے ——— لیکن عبدالعزیز کو ان سب باتوں کا تجربہ نہ تھا اس لئے اُس کی نگاہوں میں اجنبیت اور وحشت دکھائی دیتی تھی ———

سیاسی قیدیوں کی بارک میں آتے ہی تمام سیاسی قیدیوں نے بھی اُس پر نرغہ کیا۔ البتہ اُن کی نگاہوں میں تحقیر کا جذبہ نہ تھا ——— بلکہ صرف وہی قدرتی تجسس جو جیل کی ضروری پیداوار ہے اُن کی نگاہوں سے نو گرفتار کو ایک تسکین و تسلی سی محسوس ہوئی اور اُس نے اپنا قصہ سنانے پر آمادگی ظاہر کی۔ ... ——— سبھی کو اپنے اپنے جرم کا قصہ سنانا پڑتا ہے۔ وہ کب تک بچتا۔ تھوڑے سے اصرار کے بعد اُس نے قصہ شروع کر دیا ———

"میرا جرم صرف شیطانی جذبے اور وقتی حادثے کا نتیجہ ہے ——— کون اپنی ماں کو مار سکتا ہے؟ پھر جب کوئی بڑا سبب بھی نہ ہو ——— اور میری ماں تو دنیا میں میری سب سے بڑی مونس، غمگسار اور مہربان ماں تھی ——— شاید سبھی کی مائیں ایسی ہوتی ہوں گی؟ اس کی آنکھیں پُرنم ہو گئی تھیں۔

"میرا واقعہ ذرا بھی اہم نہیں ہے۔ روزانہ دنیا میں سیکڑوں ایسے قصے ہوتے ہوں گے۔ لیکن میں جس بات کو روتا ہوں وہ خود اپنی ذات کی بربادی ہے۔ ماں کی موت اپنے بقول ——— یہ بربادی نہیں تو کیا ہے ———

"میری نئی نئی شادی ہوئی، بیوی حسین ملی ——— میں اُس پر لٹو ہو گیا۔ حسین بیویوں پر لوگ شادی کے ابتدائی مہینوں میں میری ہی طرح لٹو ہو جاتے ہوں گے ——— مگر عورت ——— وہ عورت جو شریکِ زندگی بن کر انسان کا گھر بساتی ہے اکثر اس کی خانماں بربادی کا سبب بھی ہو جاتی ہے۔ وہ دنیا کی ساری محبتوں سے ہاتھ اُٹھا کر صرف اُسی کی ذات میں اپنی محبت کو مرکوز کر دیتا ہے۔ میں آج یہ سوچتا ہوں کہ کیا ماں کی محبت اتنی پھُس پھُسی ہوتی ہے کہ ایک نئی ذات، بیوی یا شوہر کی اُسے ختم کرا دے ———؟ کیا وہ ہستی جو خونِ جگر پلا پلا کر پالے دو دن کے اندر اندر اپنے مقصودِ محبت، اپنی اولاد سے مایوس ہو سکتی ہے ———"

اور اب ذرا عالمانہ اور حکیمانہ اندازِ بیان اختیار کر کے اُس نے کہنا شروع کیا:۔

"یہ فطرت نہیں ہو سکتی بلکہ محض حیوانی خواہش کا دوسرا نام ہے ——— مجھے اب اس بات کا یقین ہو گیا ہے .... ہاں تو اُس وقت .... میں کیا کہہ رہا تھا ...." ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خیالات کی بہتات اور جذبات کی شدت میں وہ یہ بھول گیا تھا کہ اُس کے افسانے کا سرا کہاں چھوٹ گیا ہے۔ لیکن جلد ہی اُسے یاد آ گیا اور اُس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا:۔

"تو میری نئی بیوی نے جب میری محبت کا یہ عالم دیکھا تو اُسے یقین ہو گیا کہ وہ مجھ سے جو چاہے کرا سکتی ہے۔ اُس نے بڑی چالاکی سے پہلے میرے چھوٹے بھائی کے خلاف جو ہمارے ساتھ ہی رہتا تھا شکایتیں شروع کیں ——— مختلف قسم کی شکایتیں، کبھی اُس کی بدتمیزی کی شکایت کبھی یہ شکایت کہ وہ اُسے چھیڑتا ہے اور کبھی ایسی شکایتیں

کہ وہ روپیہ پیسہ چرا لیتا ہے ۔ میں ہمیشہ ایسی شکایتوں کو ٹالتا رہا۔ شریر بھائی سے مجھے بے انتہا محبت تھی وہ ذہین تھا اور ماں کی آنکھ کا تارا، اس لئے میں اُسے نرمی سے سمجھا دیا کرتا تھا ــــــ

"لیکن ایک دن بیوی نے شکایت کی کہ اس نے صندوقچے میں سے ایک سونے کا زیور چرا لیا ہے۔ میں نے ماں سے یہ واقعہ بیان کیا لیکن میری شکایت پر توجہ کرنے کے بجائے ماں نے مجھے کچھ اس طور پر نصیحت کی جو مجھے ناگوار ہوئی۔ اُنھوں نے اِس بڑھنے والی کشیدگی کا تذکرہ کیا جو میری بیوی، میرے اور ماں کے درمیان پیدا کرانا چاہتی تھی۔ بھائی کی بیگناہی کا اُنھوں نے یقین دلایا اور صاف کہدیا کہ یہ بات گھڑی ہوئی ہے۔ میں عجیب گومگو کے عالم میں تھا۔

"شام کو اسکول سے بھائی واپس آیا۔ ہاتھ میں کتابیں اور ہاکی اِسٹک لئے ــــ کتابیں رکھ کر وہ کھیلنے کے لئے جانا چاہتا تھا۔ میں نے اُسے روک لیا اور غصّے میں پوچھا کہ وہ کیوں زیور چرا لیگیا۔ لیکن اُس نے میری بات ٹالدی اور یہ کہہ کر باہر جانے لگا کہ "بھابھی جان تو تمھیں اماں سے اور ہم سے لڑا دینا چاہتی ہیں" ــــ میں نے اُسے روک لیا اور غصّے کی شدت میں ایک طمانچہ مار کر کہا۔

"بدمعاش! بتاتا کیوں نہیں؟ باتیں بناتا ہے میں تو زبان کھینچ لوں گا۔ جلد بتا، کہاں چھپایا تو نے وہ زیو[ر] . . . کسے دیدیا . . . کس کے ہاتھ بیچدیا ـ" مجھے اپنی بیوی کی معصومیت کا تصور اس وجہ سے اور بھی زیادہ ہو گیا کہ بیک وقت ماں اور بھائی دونوں نے اِس غریب کے خلاف شکایت کی اور میں نے سمجھ لیا کہ دونوں نے سازش کر لی ہے۔ بھائی برابر کا تھا۔ عمر میں صرف تین سال چھوٹا طمانچہ مارنے پر بگڑ گیا اور اسٹک تان کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اِسٹک پکڑ کر چھیننی چاہی اور ہم دونوں میں کشمکش شروع ہو گئی۔ باورچی خانے سے ماں اور کمرے سے بیوی دونوں نکل آئیں۔ ماں ہم دونوں کے بیچ میں آگئیں۔ بیوی تماشہ دیکھنے لگی۔ اسٹک میرے ہاتھ میں چھٹ کر آگئی اور میں نے پوری قوت سے بھائی پر ایک ہاتھ چھوڑ دیا ــــ افسوس ہے کہ بھائی بچ گیا مگر وار ماں کے سر پر بھرپور لگا جس سے سر پھٹ گیا اور وہ آناً فاناً میں مر گئیں ــ

عبدالعزیز اتنا کہکر خاموش ہو گیا۔ خیالات میں اُسکا کھو جانا کچھ یہ ثابت کر رہا تھا کہ ماں کی موت اور اِس ناگہانی حادثے کا نقشہ اُس کے ذہن میں کھنچ گیا ہے۔ سب سننے والے رحم اور افسوس کی نظروں سے اُس بدنصیب انسان کو دیکھ رہے تھے ــ ایک آہ کھینچ کر عبدالعزیز نے سر اُٹھایا ــ ــ اور کہا ــ

"مصیبت تنہا نہیں آتی ـ میں اِس انجام کا وہم وگمان بھی نہیں رکھتا تھا۔ نتیجۃً فوراً اُنھیں سنبھالنے لگا لیکن "تیر از کمان رفتہ" کب واپس آسکتا ہے۔ تھوڑی دیر میں پڑوسی آگئے۔ اور پولیس مجھے گرفتار کر کے لے گئی۔ اگرچہ میں ضمانت پر رہا کر دیا گیا لیکن مجھ پر قتل عمد کا مقدمہ چلایا جا رہا تھا اِدھر میری مایوسی اور رنج کا عالم یہ تھا کہ میں نے مقدمہ کی پیروی کرنی بھی ضروری نہ سمجھی۔ زندگی موت سے بدتر معلوم ہو رہی تھی لیکن اسی بھائی نے پیروی اور "ڈیفنس" کا انتظام کیا جسے میں چور سمجھ رہا تھا اور اسی کے بیان سے مجھے سزائے موت سے بریت مل سکی

"عجیب بات یہ ہے کہ ماں کی ایسی حسرتناک موت کے بعد وہ گمشدہ زیور خود بیوی کے کسی دوسرے صندوق سے میں نے اتفاقاً برآمد کر لیا ــــ زیور کا اِس طرح مل جانا عمل کا ردعمل تھا میرے ذہن و دماغ نے فیصلہ کر لیا کہ ماں کی موت کا سبب بیوی کی ذات ہے ــ اور اسے طلاق دیدی۔ غصّے کی اندھی آگ نے میرے اپنے ہاتھوں ماں کو جلا دیا۔ اور اسی حیوانی جذبے نے عمر بھر کی مونس و رفیق شریک زندگی کو مجھ سے جدا کر دیا ـ اب میری زندگی میں ہمیشہ ہمیشہ اپنی حماقت کی تکلیف دہ یاد کے سوا کیا باقی ہے ــــ"

ـ ــ

جامع مسجد دہلی کو دیکھ کر

یادگارِ جمیل

شکارِ خنجر و تیغ و سنان و تیر نہیں　　اسیرِ گردشِ ایام و چرخِ پیر نہیں
جبینِ دہر پہ ہے داغِ سست بنیادی　　مگر بنائے محبت خلل پذیر نہیں

وہ اک بنائے محبت جسے حیات کہیں　　سرودِ کون و مکاں، رقصِ کائنات کہیں
چراغِ طاقِ نظر ہو تو جلوہ گاہِ صفات　　فروغِ خانۂ دل ہو تو حسنِ ذات کہیں

وہ حسنِ ذات جو وجہِ فروغِ طور ہوا　　جمالِ غیب سے عکسِ رخِ حضور ہوا
نہ رہ سکا جو پسِ پردۂ مہ و انجم　　شبیہِ مسجدِ جامع دمِ ظہور ہوا

وہ عہدِ شاہجہانی کی "یادگارِ جمیل"　　دلیلِ جذبۂ محکم، ثبوتِ عزمِ جلیل
کفِ عروسِ زمانہ میں لالۂ رنگیں　　جبینِ شاہدِ ہستی پہ سجدہ گاہِ خلیل

عروسِ نَو، گلِ روشن ضمیر، ماہِ مبیں　　چراغِ روح، جلائے نظر، فروغِ جبیں
جوابِ مسجدِ اقصیٰ بقولِ اہلِ نظر　　زاویۂ حسن و تقدس نظیرِ خلدِ بریں

اثر نواز، گلو سوز، دل نشین نغمہ — رباب شوق سے پھوٹا ہوا حسین نغمہ
شعاعِ نجم فلک کی دعائے نیم شبی — نسیمِ صبحِ گلستاں کا مرمریں نغمہ

طلوعِ مہرِ تقدس، ظہورِ صبحِ ازل — وقار "وعدۂ اول" شعورِ صبحِ ازل
لبِ تبسمِ رنگیں پہ زعفرانِ شفق — جبینِ خندۂ سیمیں پہ نورِ صبحِ ازل

نشاطِ روح، سرورِ نظر، سکونِ خیال — سرود و بربطِ فن، نغمۂ ربابِ کمال
برس پڑا جو فلک سے وہ جلوۂ قدسی — ٹھہر گیا جو زمین پر وہ "شاہکارِ جمال"

منار گنبد و محراب و صحن، بارہ دری — مقامِ چہرہ کشائی، نشانِ جلوہ گری
یہ آبِ حوض میں ہے عکس نو عروسِ چمن — کہ آئنہ میں کھڑی ہنس رہی ہو لال پری

سنبھل سکا نہ یہاں پائے گردشِ ایام — بدل سکا نہ یہاں رنگِ چرخِ نیلی فام
غروب کوکبِ اقبال ہو چکا کب کا — مٹا سکا نہ زمانہ مگر یہ نقشِ دوام

فروغِ صبحِ سعادت کی اے حسیں تمہید — چراغِ دیدہ و دل گنجِ معرفت کی کلید
تو جب سے زخمہ زنِ دل ہے بزمِ ہستی میں — ربابِ کفر سے پیدا ہے نغمۂ توحید

نظر سے شیشۂ اسرار پاش پاش کیا — دلِ جمود کو ممنونِ ارتعاش کیا
مرا کلامِ مسلسل جو راز کہہ نہ سکا — تری خموشیِ پیہم نے آج فاش کیا

جو خود نما ہو وہ دل رہ رو صواب نہیں
نہ جس میں نورِ یقیں ہو نہ حسنِ آزادی

جو خام ہو وہ نظر وجہ انقلاب نہیں
وہ سجدہ لغزشِ پا ہے کہ مستجاب نہیں

یہی سبب ہے مسلماں میں دل کشی نہ رہی
کچھ اس طرح غمِ دنیا نے پائمال کیا

جو وجہ رشکِ اجل ہو وہ زندگی نہ رہی
جگر میں خون لبِ خشک پر ہنسی نہ رہی

بہارِ لالہ نہ وہ رنگِ گلستاں باقی
وہ کارِ برق کیا اک نگاہ گلچیں نے

جمالِ تازہ نہ وہ جلوۂ جواں باقی
کہ آشیاں ہے نہ اب شاخِ آشیاں باقی

نہایت تنگ ہے خشمگیں نہیں ملتی
تھا جن کا نقشِ کفِ پا چراغِ ہفت اقلیم

طبیعتِ فلکِ نکتہ چیں نہیں ملتی
اب اُن کے دفن کو گز بھر زمیں نہیں ملتی

جبیں میں شمعِ صداقت کا نور پیدا ہو
میسر دلِ مسلم اگر ہو ذوقِ یقیں

نفس میں سوز، نظر میں شعور پیدا ہو
جہاں پڑے قدم شوقِ طور پیدا ہو

فیض جھنجھانوی

قطعہ

سجدہ گاہے ایاز و محمود دیکھی
اے خدا انجمن عالم موجود دیکھی
[illegible] مسلم کے [illegible]
شعلۂ طور انہی آتشِ نمرود دیکھی

اشرف صبوحی

فولادی عشق

وائرلیس کی ایجاد کے بعد بجلی جو کبھی غضب الٰہی کی ایک لہر تھی قدرت کی مہر ثابت ہو رہی ہے۔ اُس کے حیرت انگیز کارناموں سے دنیا اب تک جس قدر واقف ہوئی ہے اس سے کہیں زیادہ معجز نما ابھی ثابت ہونے والی ہے۔ ہر انسانی ضرورت اس کی منت پذیر ہوتی جاتی ہے۔ رزم سے لے کر بزم تک اسی کے کرشمے نظر آنے لگے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن نے تو یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہمارے لئے ابھی بہت سی چیزیں اس قہر و مہر کے پراسرار خزانے میں موجود ہیں۔ قدرت کی نامتناہی فضا میں سائنٹفک جدوجہد کا جتنا وسیع میدان اُس نے پیش کیا ہے شاید ہی فطرت کی کسی دوسری مخفی طاقت کو نصیب ہوا ہو۔ اس کی سینکڑوں کرامتیں اور ہزاروں جادوگریاں ہم دیکھ چکے ہیں۔ دیکھ رہے ہیں اور خدا معلوم کتنی ابھی دیکھنی باقی ہیں۔ ایکسریز کے کمالات ہم دیکھ چکے۔ باطن کے سارے راز کھل گئے۔ وائرلیس جہاز ہماری نظروں کے سامنے ہیں جن کا آبی سفر ریڈیو کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ ریڈیو طیارے بھی کرۂ ہوائی پر اپنا تسلط جمانے کے لئے موجود ہیں نہ کسی ہواباز کی ضرورت ہے نہ پائلٹ کی حاجت۔ زمین پر رکھا ہوا ایک آلہ سینکڑوں میل تک اس کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ آواز کا انضباط اور انتشار بھی اب ایک معمولی بات ہے۔ لندن کی تقریریں دلی میں سن لیجئے۔ موٹر میں سفر کرتے کرتے دنیا کے واقعات سے باخبر ہو جائیے۔ ٹیلی وژن پر آواز بھی سنئے اور صورت بھی دیکھئے۔ سینما میں بغیر پردے کے تصویریں ناچنے لگی ہیں۔

یہ عجائبات تو تھے ہی اب کچھ دن سے ایک عجیب تر چیز ظہور میں آئی ہے جس کو ریڈیو روبوٹ کہتے ہیں۔ یہ مصنوعی انسان ہے جو ریڈیو کے ذریعے سے سارے کام کرتا ہے۔ چوراہوں پر اس سے رہنمائی کی جاتی ہے۔ ناجائز ہجوموں میں یہ مضبوط سپاہی کا فرض انجام دیتا ہے۔ بنکوں اور پبلک اداروں میں بلوائیوں کو تلہ ہجوم سے روکتا ہے اسٹیج پر ہاتھوں کے اشاروں سے رقص سکھاتا ہے۔ یہ پتلے مختلف شکل و صورت کے ہوتے ہیں۔ جو کام ان سے لینا منظور ہوتا ہے۔ بالکل اس کے مطابق ہاتھ پاؤں، سر اور گردن حرکت کرتے ہیں۔ ان میں گویائی بھی پیدا کی گئی ہے جس سے یہ چیختے۔ چلاتے۔ ڈانٹتے۔ بھونکتے اور حکم دیتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں سرچ لائٹ کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ سب سے عجیب بات یہ ہے کہ اس فولادی پتلے میں کچھ اس قسم کی احساسی قوت رکھی ہے کہ پیر کی آہٹ اور روشنی کی شعاع سے یہ زندہ ہو کر فوراً حرکت میں آجاتا ہے۔

ایک پروفیسر نے اس میں تکلم اور نشست و برخاست کا خاصہ بھی رکھا ہے۔ مزاج پوچھتا ہے۔ جواب دیتا ہے ٹیکچر ادا کرتا ہے۔ سگریٹ پیتا ہے۔ دوسرے کا سلگاتا ہے تھیٹر کے ٹکٹ گھر کے پاس کھڑے ہو کر تماشائیوں کی گنتی کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح طب کے ایک ماہر نے ایسا روبوٹ بنایا ہے جو علم تشریح کی تعلیم کے لئے ایک بہترین چیز ہے۔ اس کے اندر تمام انسانی اعضاء موجود ہیں اور وہ سب متحرک ہو سکتے ہیں اس کی آنکھیں بھی بالکل آنکھ کی ساخت پر بنائی گئی ہیں۔

آنکھ بنانے کی مشق اُن پر کی جاتی ہے۔

جرمن کے ایک جادوگر نے تو یہ غضب ڈھایا ہے کہ اس بجلی کے کھلونے میں پوری جان ڈال دی ہے۔ ستم ظریف نے اس میں جذبات بھی پیدا کرنے چاہے ہیں لیکن بدنصیبی سے پہلے صرف حسن وعشق کے جذبے کی آزمائش کی گئی یہ جذبہ جس طرح انسانوں کے لئے ہلاکت آفریں اور تکلیف دہ ہے ویسا ہی اِن فولادی دل اور گردہ والوں کے واسطے بھی ثابت ہوا۔ بنانے کو تو بنانے والے نے یہ طلسمی پتلے بنا ڈالے اور اُن کا چہرہ مہرہ خد وخال، ہاتھ پاؤں، کمر، چال ڈھال، لب ولہجہ بلکہ وہ ساری نزاکتیں اور دلفریبیاں بھی بھر دیں جو اس قسم کے جذبات کے لئے ضروری ہیں۔ مگر جب ہر طرف سے ان کے معاشقہ کی داستانیں۔ اُن کے پریشان کن واقعات سامنے آنے لگے اور پولیس کی بازپرس نے ناک میں دم کر دیا تو یہی ایجاد ایک عذاب بھی ہوگئی۔

یورپ تنوع پر مرتا ہے۔ وہاں کی جدت پسندی نے اول اول اِس طرف کافی توجہ کی۔ سینکڑوں پتلے فروخت ہوگئے۔ کسی نے اپنی خدمت کے لئے نوجوان حسن کا پتلا خریدا تو کسی نے ایک حسین پتلی اپنی دلگی کا شغلہ سمجھ کر خریدی۔ چنانچہ ایک امیر گھر میں اسی طرح کی ایک پتلی تھی اور قریب کے مکان میں ایک پتلا۔ دونوں اپنے مالکوں کی فراخ دستیوں کی بدولت پرستان کی مخلوق معلوم ہوتے تھے۔ نکلتے بیٹھتے دونوں کا آمنا سامنا ہوگیا۔ جذبۂ محبت رنگ لایا۔ شام ہوتی اور دونوں غائب۔ رفتہ رفتہ مالکوں کو اُن کی عدم موجودگی محسوس ہوئی۔ فہمائش کی گئی مگر بے سود۔ ایک روز اُس فولادی پتلی بلی کے آقا ہوا کھاتے ہوئے اتفاق سے قریب کے پارک میں نکل گئے۔ پھرتے پھرتے ایک گوشے میں کیا تماشا دیکھتے ہیں کہ اُن کی بلی اور اُن کے پڑوسی نواب کا فولادی خدمتگار ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے ہیں یہ دیکھ کر اُنھیں پہلے غصہ آیا۔ پھر تعجب ہوا۔ چند منٹ تک اُن کے معاشقہ کی سیر دیکھتے رہے۔ لیکن جب اُن کی بے تکلفی کسی طرح ختم ہونے ہی پر نہیں آئی تو اُنھوں نے تحکمانہ لہجے میں پکار کر کہا " بلی یہ کیا ہو رہا ہے ؟"

بلی نے پلٹ کر جو دیکھا تو اپنے آقا پر نظر پڑی۔ بغیر کچھ جواب دئے وہ تیز قدموں سے اپنے مکان کی طرف روانہ ہوئی اور فولادی نوجوان منہ پھیر کر کھڑا ہوگیا۔ گھر پہنچ کر مالک نے اپنے پڑوسی نواب کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ اور ایک خط اُن کے موجد ڈاکٹر کو لکھا کہ آپ کے اِن پتلوں کا جذبۂ تعشق حد سے گزر گیا ہے۔ اِس کی تدبیر ہونی چاہیئے۔

اِدھر تو بلی کی مالکہ نے بلی کو ڈانٹا ڈپٹا اور اُدھر اُس نواب کی بیگم صاحبہ نے اپنے ڈارلنگ کو ملامت کی اور اس سے وعدہ لیا کہ آیندہ بلی کے ساتھ کہیں نہیں جائے گا۔ لیکن گوشت کے بنے ہوئے اِنسانوں میں جب محبت کے نقش بن کر نہیں مٹ سکتے ہیں تو اِن فولادی پتلوں کے یہ جذبات کیونکر فنا ہو سکتے تھے۔ چھپ چھپ کر ملاقاتیں ہونے لگیں اور جب کبھی اِن پر سختی کی گئی یہی جواب ملا کہ ہم مجبور ہیں فولادی زنجیروں نے ہمیں وابستہ کر دیا ہے۔" مجبوراً بلی کارخانہ بھیج دی گئی اِس درخواست کے ساتھ کہ اِس کے دماغ کا وہ خانہ جس میں محبت پرورش پاتی ہے ذرا تنگ کر دیا جائے۔ کارخانے جاتے جاتے بلی ڈارلنگ سے اشارہ کرتی گئی جو اپنی کوٹھی کے برآمدہ میں کھڑا ہوا دیدار کا منتظر تھا۔

بلی " دست بدستِ دگرے " کارخانہ پہنچی تو ڈارلنگ بھی تماشائیوں کی بھیڑ میں موجود تھا۔ ڈاکٹر جب بلی کو اپنے خاص کمرے میں لے گیا تو ڈارلنگ نے دروازے کے شیشوں میں سے جھانکنا شروع کیا۔ ڈاکٹر نے اپنے اَوزار درست کرتے ہوئے بلی سے مخاطب ہو کر کہا۔

بلی: تم نے ہماری ہنرمندی کو بدنام کر دیا۔

بلی۔ بدنامی۔ ڈاکٹر صاحب میں نے تو آپ کے کمال کو چار چاند لگا دئے۔

ڈاکٹر۔ پھر تمہارے مالک کو تمہاری شکایت کیوں پیدا ہوئی۔

للی۔ رقابت!

ڈاکٹر۔ رقابت کیسی؟

للی۔ وہ اپنے لئے میری محبت کا طلبگار ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ میں اس کی ہوس رانیوں کا جواب دوں۔ مگر فولاد میں نرمی کہاں۔ فولادی دل کو متاثر کرنے کے لئے فولادی ہی دل چاہیئے۔

ڈاکٹر یہ سن کر ششدر ہو گیا۔ وہ اپنی ایجاد پر نازاں تھا۔ یہ دیکھ کر کہ اس کے پیدا کئے ہوئے احساسات اس درجہ مکمل ہیں اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس اثنا میں للی کی نظر دروازہ پر پڑی۔ دیکھا کہ ڈارلنگ کھڑا آنسو بہا رہا ہے۔ للی بےچین ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے ڈاکٹر نے پھر اپنے اوزار سنبھالے۔ للی کے قریب گیا۔ اور اس کے پاؤں کے نیچے گدی پر کچھ ٹٹولنے لگا مگر یہ معلوم کر کے کہ للی رو رہی ہے اس سے پوچھا۔ للی! تم رو کیوں رہی ہو"؟

للی۔ اس لئے کہ آپ محبت کو مٹانا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر۔ وہ محبت جس سے دوسروں کو تکلیف ہو مٹانے کے قابل ہے۔

للی۔ محبت اگر مٹ گئی تو زندگی میں کیا لطف؟

ڈاکٹر۔ بات تو ٹھکانے کی ہے۔

للی۔ تو پھر یہ آپ کا ظلم ہوگا۔

ڈاکٹر۔ کس طرح۔

للی۔ اس طرح کہ میرے ساتھ ایک اور زندگی تباہ ہونے والی ہے۔

ڈاکٹر۔ وہ کون ہے؟

للی۔ ڈارلنگ!

ڈاکٹر قہقہہ مار کر ہنسا اور یہ کہہ کر "مصنوعی زندگی بھی کتنی محسوسات سے لبریز ہو سکتی ہے" اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

ڈاکٹر نے اس مشین کا اوپر کا حصہ کھول ڈالا دماغ کے کل پرزوں پر غور کیا۔ کچھ چھوٹی پلیٹیں تھیں۔ کسی کے نقوش چاقو کی نوک سے کھرچے۔ کسی کے گہرے کئے۔ کوئی پیچ ڈھیلا کیا کوئی کسا۔ اور پھر اس نے ہر پرزہ کو اپنی جگہ رکھ کر سر کو سر کی جگہ جوڑ دیا۔

للی زندہ ہو گئی۔ اب اس کی نگاہوں میں نہ پہلا سا رسیلا پن تھا نہ اس کے چہرہ پر وہ تاثراتِ قلبی کی علامتیں۔ وہ محض ایک فولادی پتلا تھی۔ ڈاکٹر نے کواڑ کھول دئیے۔ اور کہا: للی جاؤ۔ اپنے مالک کے پاس جاؤ اب تم سے اس کو کوئی شکایت نہیں پیدا ہوگی!

آگے آگے للی تھی اور پیچھے پیچھے ڈارلنگ۔ راستہ میں کئی مرتبہ ڈارلنگ نے اس کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا لیکن للی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اس ناکا پہنچ کر جہاں سے دونوں کو الگ ہونا چاہیے تھا۔ جب ڈارلنگ نے للی کا ہاتھ پکڑ کر یہ کہا کہ "للی کیا تمہاری محبت میرے لئے ختم ہو گئی۔ کیا مجھ کو تمہاری طرف سے مایوس ہو جانا چاہیئے"؟ تو وہ ہاتھ جھٹک کر یہ کہتی ہوئی کہ 'محبت! کیسی محبت! میں اس جذبہ سے بالکل خالی ہوں'۔ روانہ ہو گئی۔ اور ڈارلنگ حیرت زدہ مایوس کھڑا کا کھڑا رہ گیا ایک عجیب تماشا تھا۔ فولادی پتلے کا دل پانی ہو ہو کر آنکھوں سے بہ رہا تھا جسم تھر تھرا رہا تھا اور اس کی ساری مصنوعی دنیا تاریک تھی۔

خدا معلوم کتنی دیر ڈارلنگ اس چوراہے پر کھڑا رہا آخر ایک سخت گرفت نے اسے چونکا دیا۔ اس نے اپنے مالک کو خفا ہوتے ہوئے دیکھا۔ آقا کی ہر ملامت کا جواب صرف آنسو تھے جب ملامت اور آنسوؤں نے کوئی فیصلہ نہیں لیا تو تنگ آ کر ڈارلنگ بولا "میرے آقا۔ اب میں آپ کے مطلب کا نہیں رہا۔ مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دیجئے یا کارخانے بھیج کر للی کی طرح میرے دماغ کی کل بھی بہت درست کرا لیجئے۔ آقا نے ڈارلنگ کو کوئی جواب نہیں دیا اور اس کو ساتھ لے کر اپنے مکان کی طرف روانہ ہوا۔ راستے بھر ڈارلنگ کی نگرانی کرنی پڑی۔ کیونکہ وہ ہر دس قدم پر رک جاتا تھا اور بچوں کی طرح مچلنے لگتا تھا۔

گھر پہنچ کر آقا اور ان کی بیگم صاحبہ میں دیر تک مباحثہ رہا۔ صاحب ڈارلنگ کو بھی للی جیسا جذبات محبت سے بیگانہ

بنانے پر مُصر تھے وہ اُس کو محض ایک "بوانے" دیکھنا پسند کرتے تھے۔ لیکن گھر کی مالکہ یہ سادگی چاہتی نہ تھی۔ وہ اُس میں حُسن وعشق کے تمام کرشمے دیکھنا چاہتی تھی جو فیشن ایبل دُنیا کا ایک ضروری جزو ہے۔ ایسے معاملات میں فتح ہمیشہ صنفِ نازک کی ہوا کرتی ہے اِس لیئے ڈارلنگ کا جذبۂ عشق بدستور کارفرما رہا اور ڈارلنگ ہر طرف سے بے نیاز ہو کر بلی اور صرف بلی کے خیال میں محو ہو گیا۔ مالک اور مالکہ میں اُس کے متعلق کئی دفعہ شکر رنجی بھی ہوئی۔ خانہ داری کی زندگی بدمزہ ہوتے ہوتے رہ گئی مگر نہ ڈارلنگ کا علیٰحدہ کرنا امکان میں تھا اور نہ ڈاکٹر سے اس کی اصلاح کرانا۔

ڈارلنگ اِس اندرونی کشمکش سے بہت بے چین تھا اُدھر بلی کی محبت اس کو چیرتی چلی جاتی تھی اور اُدھر مالکہ کا تحکمانہ شوق آٹھ پہر اس کی جان نکالے لیتا تھا۔

دو گونہ رنج وعذاب است جانِ مجنوں را
بلائے صحبتِ لیلیٰ و فرقتِ لیلیٰ

اِس کشاکش کا انجام یہ ہوا کہ ایک دن ڈارلنگ نے اِس حرماں نصیب زندگی سے تنگ آ کر خودکشی کی ٹھان لی بندوق، ریوالور، خنجر یا کوئی سمی جرعہ بھی تو اِس فولادی جان کیلئے کچھ موثر نہ تھا بشین کی موت کے لئے تو مشین کی ترتیب کا انتشار ہی ہونا چاہیئے اور یہ ترکیب وہ ڈاکٹر کے کمرے میں دیکھ چکا تھا جہاں بلی پر دستکاری کی گئی تھی۔ چنانچہ وہ موقع کا منتظر رہا اور شام کو جب اُس کی مالکہ ہوا خوری کو گئی تو یہ بھی چپکے سے نکل گیا اور قریب کے پارک میں ایک سنسان جگہ جا بیٹھا۔

سورج غروب ہونے کے بعد اُس نے آہستہ آہستہ اپنی گردن کے پیچ ڈھیلے کرنے شروع کئے۔ جو پیچ کھلتا یہ اُسے دور جا کر پھینک آتا۔ اِسی طرح دماغ کے کئی ضروری پرزے بھی اُس نے نِکال کر ضائع کر دئے۔ اب اُس کے بیجان ہونے میں صرف اِتنی کسر تھی کہ سر دھڑ سے الگ کر دیا جاتا جس کے لئے مددگار کی ضرورت تھی۔ مددگار وہاں کہاں؟ آخر اُس نے کھڑے ہو کر زور سے اپنے بدن کو جنبش دی اور دونوں ہاتھوں کی مدد سے اپنے سر کو دور پھینک دیا۔ سر کا الگ ہونا تھا کہ ایک ہولناک آواز نکلی۔ پانی کا ایک فوارہ سا چھوٹا اور ڈارلنگ کا سارا جسم پرزے پرزے ہو گیا۔

صبح کو پولیس اسٹیشن پر ہزاروں تماشائیوں کا اجتماع تھا بیسیوں فولادی پرزے بکھرے پڑے تھے اور خفیہ پولیس اِس خودکشی کی تفتیش کے لئے سرگرم کار تھی محکمۂ سُراغرسانی میں یہ ایک نئی چیز تھی اِس لئے ہر شخص دلچسپی لے رہا تھا۔

نیند اُچاٹ کر دینے والا سچا فسانہ

ذاتی ڈائری کے اوراق پر مشہور ادیب مزاحیہ نویس شوکت تھانوی کا تبصرہ۔

آج میں نے ایک ایسی کتاب شروع کی ہے کہ آج کی نیند کا خدا ہی حافظ ہے۔ اس کتاب کا نام تو بعد میں بتاؤں گا مگر میں اسے "دو آتشہ" سمجھ رہا ہوں۔ شہیدِ ملت مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کی داستان ہے اور مولانا عبدالماجد دریابادی ایسے سحر نگار کا بیان اب بتائیے کہ نیند کا کیا امکان باقی رہا۔ مگر یہاں نیند کا کیا سوال جب سے یہ کتاب ہاتھ آئی ہے ہم خود نیند کو سُلانے کے لیئے مہاتما گاندھی کی یہ مشہور لوری سُنا رہے ہیں کہ اُٹھ جاگ مسافر بھور بھئی اب رین کہاں جو سووت ہے" اور اپنی آنکھوں کے کان میں چپکے سے کہہ چکے ہیں کہ "جو سووت ہے وہ کھووت ہے"۔ لہٰذا آنکھیں خود انتظار میں ہیں کہ نیند سو جائے تو وہ چپکے سے جاگ کر یہ کتاب پڑھنا شروع کر دیں۔

اِس کتاب کا نام ہے محمد علی (ذاتی ڈائری کے چند اوراق) مولانا عبدالماجد دریابادی کی اس کتاب کو ادارۂ اشاعت اُردو حیدرآباد دکن نے شایع کیا ہے اور قیمت پونے تین روپے ہے۔

مولانا عبدالماجد کو میں بہت دنوں سے جانتا ہوں اور بہت دنوں کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اُن سے ذاتی طور پر مِل کر اُن کو پڑھنا اتنا ہی مشکل ہے جس قدر اُن کی تصانیف کو پڑھ کر اُن سے ملنا آسان معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں برافگندہ نقاب نظر آتے ہیں اور بالمشافہ ملاقات میں حجاب اندر حجاب اُن کی شخصیت طرفہ طلسم رانہ ہے۔ ع

دُور سے پاس پاس سے دُور دُور سے

قریب جاکر بات کیجیے تو نہایت کم سخن۔ بات بات پر نظریں نیچی ہوئی جاتی ہیں۔ نہایت آہستہ سے ایک آدھ بات کا جواب دیا جاتا ہے۔ ملنے والے کی تشنگی بڑھتی ہی جاتی ہے مگر ساقی کا بخل کسی طرح نہیں گھٹتا لیکن تحریر پڑھیئے تو یہی پیکرِ شرم و حیا یہی مجسمۂ سنجیدگی یہی کھدری لباس والا عبا پوش اور یہی خشک فلسفی۔ اپنی تمام شادابیوں۔ تمام رنگینیوں۔ تمام صناعیوں اور تمام سحر طرازیوں کے ساتھ کبھی بہکتا اور کبھی بہکاتا کبھی گنگناتا اور کبھی زمزمے برساتا کبھی خود جھومتا اور کبھی دوسرے کو جھماتا ہوا دماغ پر طاری ہو کر دل میں سماتا چلا جاتا ہے۔ موضوع کچھ بھی ہو ادب نہ سہی فلسفہ سہی فلسفہ نہ سہی مذہب سہی مگر ہر جگہ شادابی موجود شگفتگی برقرار اور پھر نتیجہ کے اعتبار سے ہر تحریر ایک کوہِ وقار۔

مولانا دریابادی کے اِس ادبی تلاطم سے میں ناواقف نہ تھا کہ اُن کی ہر تحریر ایک سیلاب کی طرح آتی ہے اور پڑھنے والا ایک قطرے کی طرح اِس میں شامل ہو کر شریکِ سیلاب بن جاتا ہے وہ اِس سیلاب میں تھپیڑے کھاتا ہے موجیں اُس کو اُچھالتی ہیں۔ بھنور اس کو رقص کراتے ہیں۔ مدوجزر اس کو جلترنگ سُناتے ہیں اور وہ ان تمام کیفیات میں اس طرح گم ہو جاتا ہے کہ نہ قطرہ بن کر فنا ہو نا یاد رہتا ہے نہ حباب بن کر اُٹھنے کا اُسے ہوش رہتا ہے۔ یہاں تک کہ سیلاب گزر جاتا ہے اور وہ یکایک چونک کر اپنے کو محض ایک قطرہ پاتا ہے۔ سیلاب مزید کے لیئے بیقرار۔ طغیانِ نو کا امیدوار۔

اِس واقفیت کے علاوہ یہ بھی معلوم تھا کہ محمد علی ایسے محبوب کا ذکر ہے جس سے ہماری طرح محبت تو سب ہی کو ہو گی۔ مگر عبدالماجد کو تو عشق تھا۔ عبدالماجد کی سحر نگاری کو جانے دیجیے:

اس باب میں تو وہ عاشق کا کردار پیش کرنے والے ہیں۔ جو افسانہ وہ لکھ رہے ہیں اس کے ایک کردار خود بھی ہیں۔ اب تک اپنے قلم فرسائیوں سے دلربائیاں کر چکے ہیں مگر آج تو خود اپنی دلکشائی پر تلے ہوئے ہیں۔

یہ سب کچھ معلوم تھا مگر کتاب شروع کردی۔ ایک صفحہ دو صفحے تین صفحے لیجئے ہم کھوئے گئے اب کون ہمیں ہم کو ڈھونڈ کردے۔ بچپن میں "نیلی چھتری" پڑھ پڑھ کر امتحانوں میں فیل ہوا کرتے تھے۔ سب کہتے تھے کہ رات رات بھر پڑھتا ہے اور فیل ہو جاتا ہے۔ کسی کو کیا معلوم کہ امراؤ جان اور نیلی چھتری۔ حاجی بغلول اور طرحدار لونڈی (اس وقت) کو اس میں شامل تھیں نہیں۔ ان ناولوں میں ناولوں کا پلاٹ گم کردیا تھا۔ رات کا پتہ نہ چلتا تھا۔ اور کتاب ختم کرکے سوتے تھے۔ مگر یہ ناول نہیں ہے ایک شعلہ مذہبی اور سیاسی لیڈر کے حالات ہیں جن کو ایک خشک فلسفی نے ایک خالص مولوی نے لکھا ہے مگر معلوم یہ ہوتا ہے کہ مولانا عبدالماجد نے اگست ۱۹۱۲ء میں مولانا محمد علی سے ملا دیا ہے اور اس کے بعد سے ہم خود مولانا کے ساتھ ہیں۔ عبدالماجد صاحب اپنے دریاباد میں ہوں گے ان سے کوئی مطلب نہیں۔ اب ہم مولانا محمد علی کے ہمراہ کبھی ہنس رہے ہیں کبھی رو رہے ہیں۔ کبھی آزاد ہیں کبھی جیل میں ہیں۔ کبھی اخبار نکال رہے ہیں۔ کبھی ماش کی کھچڑی کھا رہے ہیں کبھی ذیابطیس میں مبتلا ہیں۔ کبھی ہسپتال میں پڑے ہیں کبھی ریل میں کبھی جہاز میں کبھی کبھی عبدالماجد سے بھی ملاقات ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ایک پوری زندگی ایک ہی رات میں بسر کی اور صبح کے قریب پتہ چلا کہ رات ختم ہو چکی ہے۔ کتاب اگر ختم نہ ہو چکی ہوتی تو شاید اب بھی پتہ نہ چلتا۔ جی ہاں ناول ہی نہیں اس قسم کی ٹھوس تصانیف بھی گم کردیا کرتی ہیں۔ مولانا عبدالماجد کی تحریری جادوگری کے تو ہمیشہ سے قائل تھے مگر اس کتاب میں تو ساحر خود مسحور رہے۔ ساقی خود مخمور رہے۔ صیاد خود صید بنا ہوا نظر آتا ہے۔ بڑے مصور بنے پھرتے تھے۔ کاغذ پر خود کھنچ کر رہ گئے انجام یہ کہ خود تصویر بننا پڑا۔

اس کتاب کو ختم کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس کو صرف ایک مرتبہ پڑھنا کافی نہیں ہو سکتا اور اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ایک بیساختہ تمنا یہ بھی پیدا ہوتی ہے کہ اب محمد علی زندہ ہوں اور اب ہم ان کو سر آنکھوں پر بٹھائیں ان کے لئے دیدہ و دل فرش راہ کریں۔ ان کے اشاروں پر چلیں اور ان کے نعرۂ تکبیر پر میدان جہاد میں سرخروئی حاصل کریں۔ مولانا عبدالماجد! آپ بڑے مصلحت بین ہیں کہ محمد علی کو محمد علی کے بعد دنیا سے روشناس کرایا۔ محمد علی تو خیر یوں بھی زندہ تھے ان کو زندہ رہنا تھا۔ مگر اس کتاب نے محمد علی کی زندگی کا احساس ہم مردوں کو بھی کرا دیا۔

ہماری کتابیں

سنگ وخشت:۔ از کنہیا لال کپور۔ ایم۔ اے۔ ناشر کتبۂ جدید لاہور قیمت عا۔ کاغذ وطباعت عمدہ کتابت کی کہیں کہیں غلطیاں جیسے بریانی میں کنکر۔ پڑھنے والوں کو تکلیف دینے کے لئے غلط نامہ موجود نہیں۔

فرض کیجئے آپ ایک بڑی اونچی فلک بوس عمارت بنا رہے ہیں۔ دیواریں اُٹھ چکی ہیں اور پہلی منزل تیار ہو گئی ہے۔ ایسے وقت میں انجینئر اطلاع دیتا ہے کہ مکان کی نیو ٹھیک نہیں یا کسی دیوار میں خم ہے جس کی وجہ سے دوسری منزلیں تو خیر شاید پہلی منزل کا بوجھ بھی دیواروں سے نہ اُٹھ سکے اور عجب نہیں کہ پہلی برسات ہی میں آپ کا مکان زمین بوس ہو جائے۔ سوچئے تو آپ ایسی حالت میں کیا کریں گے۔ میرے خیال میں تو آپ فوراً ہی بنی ہوئی عمارت گرا کر جھکی ہوئی دیوار کے بجائے ایک نئی دیوار اور اُس پر نئی عمارت کے تعمیر کرنے کا انتظام کریں گے۔

سنگ وخشت کے مصنف بھی کچھ اسی قسم کے کام کر رہے ہیں۔ اُن کا مقصد جھکی ہوئی دیوار کو ڈھا کر اسکی جگہ پر ایک سیدھی اور مضبوط دیوار تعمیر کرنا ہے جو ایک مستحکم اور شاندار عمارت کا بوجھ سنبھال سکے۔

ظرافت ہر شخص کے بس کی چیز نہیں۔ عالم ہر شخص بن سکتا ہے۔ لیکن ظریف ہر شخص نہیں بن سکتا۔ رُلانے کا "فرض" بہت سے لوگ انجام دے سکتے ہیں لیکن ہنسانے کی "خدمت" بہت کم لوگوں کے نصیب میں آتی ہے۔ آزادی اور خود مختاری کے جلوس میں ہنسی اور قہقہے ہوتے ہیں۔ غلامی اور محکومیت کے ساتھ رونا اور بسورنا۔ آزاد فرانس کا والٹیر اور محکوم ہندوستان کا تیرا اسی نظریہ کے ترجمان ہیں۔ دُنیا میں ایک ہی چیز سے بیک وقت تعمیر کا کام بھی لیا جا سکتا ہے اور تخریب کا بھی۔ ظرافت بھی اس نظریہ سے علیحدہ نہیں۔ کبھی اس کی برکت سے۔

ع
پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال

وغیرہ قسم کی چیزیں سُنکر ایک شاعر سب پر غالب ہو جاتا اور کبھی اس کا انجام کیٹس کا سا ہوتا ہے۔

ادب میں ظریف اور طنز نگار عموماً عبوری دَور میں پیدا ہوتے ہیں۔ جب نئے نئے تجربے کئے جاتے ہیں اور جدتوں کے زلزلوں سے ادب عالیہ کے محلات کی دیواریں ہلنے لگتی ہیں عین اسی زمانہ میں ان محلات میں ایسی ترمیم وتنسیخ بھی ہوتی ہے جس سے وہ جدید طرز رہایش کے مطابق بن سکیں اسی ترمیم وتنسیخ سے بند کمروں کے دروازے کھل جاتے تاریک حجروں میں کھڑکیاں لگ جاتی اور آفتاب کی مسکراتی ہوئی کرنیں تازہ اور صاف ہوا کے ساتھ کمرے میں داخل ہو کر اُنھیں معطر اور منور کر دیتی ہیں۔

کنھیا لال کپور نے جدید رسالوی اور کتابی ادب کا اچھا مطالعہ کیا ہے۔ اُنھوں نے طنز کے نشتر کو تیز کر کے ہمارے ادبی جسم میں جو فاسد مادہ جمع ہو رہا تھا اُسے نکالنے کی کوشش کی ہے۔ اس لحاظ سے اُن کی طنز نگاری تخریبی نہیں بلکہ تعمیری ہے وہ کسی گمراہ شاعر کو راہ راست پر تو لا سکتی ہے لیکن خودکشی پر مجبور نہ کرے گی چنانچہ غور کیجئے تو خود کتاب کے نام سے "سنگ وسر" کا تصور آنے کے باوجود بھی اُن کی تعمیری ذہنیت کا ثبوت ملتا ہے

اُنھوں نے ہمارے سماج اور سماجی اَدب کا قریب سے مطالعہ کیا ہے اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے طنزیہ تنقیدی اَدب کے اُفق پر ایک رَوشن ستارہ طلوع ہوا ہے۔ اُنھیں ایک ایسے اعلیٰ کارٹون ساز سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو اپنے موضوع کی چند خصوصیات کو واضح اور نمایاں کر کے اِس طرح پیش کرتا ہے کہ آپ دیکھتے ہی مُسکرا دیں کبھی بھول نہ سکیں اور اگر موضوع میں کوئی صلاحیت موجود ہے تو خفا نہ ہو بلکہ اپنی اِصلاح کر لے۔

موجودہ مجموعہ ۱۶ مضامین پر مشتمل ہے جس میں "رومانس کی تلاش" کے سوا جو ذرا بھرتی کا سا معلوم ہوتا ہے باقی جملہ مضامین اتنے دلچسپ ہیں کہ آپ کتاب ختم کئے بغیر نہیں رکھ سکتے لیکن چینی شاعری علامہ ظہور، قومی لباس غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں اور خاص طور سے پڑھنے کے لایق ہیں۔

مصنف کی تحریر میں رَوانی، گھلاوٹ اور سادگی ہے ایسی جسے دیکھ کر گولڈ اِسمتھ اور اڈیسن کی یاد تازہ ہو جاتی ہے البتہ ہمیں اُن سے ایک شکایت ہے اور وہ یہ کہ "نے" کا اِستعمال کہیں تو کسی "دہلوی استاد" یا "لکھنوی ماہر فن" کی طرح کرتے ہیں اور کہیں خالص "پنجابی" اہل زبان کے مانند۔ کاش وہ ایک طریقہ استعمال اختیار کریں خواہ وہ ڈاکٹر تاثیر ہی کا کیوں نہ ہو۔

مسلم ضیائی ایم۔اے

روحِ اقبال

از ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ

اِس کتاب میں جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے بڑی دقیقہ سنجی اور کاوش سے علامۂ اقبال مرحوم کی شاعری اور فلسفہ کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا ہے۔ نہایت دَقیق مضامین کے بیان کرنے میں بھی لُطفِ زبان اور ادبیت کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ علامۂ اِقبال پر اس سے بہتر کوئی کتاب کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی

قیمت ← → چار روپیہ چار آنہ

نیا اُردو اَدب

وہ کتابیں جن کے بغیر کوئی لائبریری مکمل نہیں کہی جا سکتی

گرداب۔ اَز احمد ندیم قاسمی۔

گرداب میں ندیم اپنے آپ کو ایک نئے اور نرالے رنگ میں پیش کر رہا ہے۔ ان افسانوں میں اُس نے پربتوں اور میدانوں کی کھُلی دُنیا سے نکل کر موجودہ پُرشور تہذیب سے گونجے ہوئے شہروں کی زندگی کا جائزہ لیا ہے۔ ندیم کی انفرادی خصوصیات اچھوتی فن کاری اور رسیلی زبان کی جھلکیاں آپ نے اس کی نظموں، قطعوں اور دیہاتی افسانوں میں دیکھی ہوں گی۔ اب ہندوستان کے اس جوان فکر ادیب کو نئے روپ میں دیکھئے۔

قیمت تین روپے بارہ آنے مجلد بہترین سہ رنگا گردپوش

رنگ محل۔ از حضرت ساغر نظامی۔

رنگ محل ساغر کی رومانی نظموں، غزلوں اور گیتوں کا نیا مجموعہ ہے۔ شعر و حکمت کا موثر امتزاج، رومانیت و واقعیت کا دلنواز مرکب، انسانی ذہن و رُوح کے لئے فکر و نشاط کا جدید پیمانہ،

قیمت دو روپے آٹھ آنے مجلد رنگین گردپوش۔

زندگی کے نئے زاویے۔ از رئیس احمد جعفری

یہ وہ افسانے ہیں۔ جو انسانی کردار، انسانی ذہنیت، انسانی نفسیات، اور انسانی سرشت کا نیا رُخ پیش کرتے ہیں۔ یہ افسانے نہیں ہیں زندگی کی چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔

قیمت مجلد تین روپے۔ رنگین گردپوش

یقین و عمل موجودہ دور انتشار و بے چینی کا حل صدر جمعیتہ فلاسفہ لندن وائیکونٹ سموئیل کے قلم سے۔ حالیہ ادب میں یہ بہترین تصنیف اور عدیم النظیر کتاب ہے۔ تقریباً ساری ترقی یافتہ زبانوں میں اور سارے متمدن ممالک میں ہزارہا کی تعداد میں شائع ہو چکی ہے۔ اردو زبان میں پہلی بار یہ تحفہ پیش کیا جا رہا ہے۔

قیمت دو روپے چار آنے مجلد رنگین گردپوش

ٹیگور اور اُن کی شاعری۔ از مخدوم محی الدین ایم اے

ٹیگور کی شاعرانہ عظمت سے کون واقف نہیں اُن کی شاعری نے بین الاقوامی مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ یہ شاعر مشرق پر سب سے پہلی مستقل کتاب ہے۔ دوسرا ایڈیشن۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

رئیس الاحرار محمد علی مرحوم۔ از مولنا عبدالماجد دریابادی۔

رئیس الاحرار مرحوم کی فطری اور ذہنی صلاحیتوں اُن کی علمی اور دماغی قابلیتوں، اُن کے جوش عمل؛ اُن کی ہمت بلند و عزم راسخ، اُن کی متواتر اور مسلسل

علی جد و جہد، اُن کے خلوص و ایثار، تواضع و انکسار، اُن کی آزادانہ تقریر، اُن کی بلندی تحریر، اُن کے موثر و مدلل زور بیان کی تصویر ذاتی علم و تجربہ کی بناء ہندوستان کے سحر نگار ادیب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے کھینچی ہے۔ اور اس طرح کھینچی ہے کہ کوئی خد و خال چھوٹنے نہیں پایا۔ اس کے مطالعہ سے کسی ہندوستانی کو محروم نہیں رہنا چاہیئے۔

قیمت۔ دو روپیے بارہ آنے۔

مضامین عبدالماجد دریابادی از مولانا

دریابادی کے ادبی تلاطم سے کون ناواقف ہے۔ ان کی ہر تحریر ایک سیلاب کی طرح آتی ہے اور پڑھنے والا ایک قطرے کی طرح اس میں شامل ہو کر شریک سیلاب بن جاتا ہے۔ وہ اس سیلاب میں تھپیڑے کھاتا ہے موجیں اُس کو اُچھالتی ہیں۔ بھنور اس کو رقص کراتے ہیں۔ مد و جزر اس کو جلترنگ سناتے ہیں۔ اور وہ ان تمام کیفیات میں اس طرح گم ہو جاتا ہے۔ کہ نہ قطرہ بن کر فنا ہونا یاد رہتا ہے۔ نہ حباب بن کر اُٹھنے کا اُسے ہوش رہتا ہے۔ یہاں تک کہ سیلاب گزر جاتا ہے اور وہ یکایک چونک کر اپنے کو محض ایک قطرہ پاتا ہے۔ سیلاب مزید کے لئے بیقرار۔ طغیانیوں کا اُمیدوار"۔ یہ شوکت تھانوی کی رائے ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر لیجئے۔

قیمت تین روپیے بارہ آنے

مُردوں کی مسیحائی (مقالات سیرت کا مجموعہ)

حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے عشق و محبت نبی صلعم میں ڈوب کر لکھے ہوئے مقالات کا مجموعہ۔ اعلیٰ ترین کاغذ۔

قیمت تین روپیے چار آنے مجلد رنگین گرد پوش

نغمات ماہر۔ از حضرت ماہر القادری۔

جوانی کی مسکراہٹیں، دوشیزگی کی انگڑائیاں، حسن کے سدا بہار پھول، قوم و ملت کا دھڑکتا ہوا دل، آزادی کی مضطرب روح، زندگی کی تفسیر، پاکیزہ زبان، بلند افکار، اچھوتا تخیل، عدیم النظیر انداز بیان اور وہ سب کچھ جسے شعر و ادب کی روح کہہ سکتے ہیں۔

قیمت۔ تین روپیے۔ مجلد رنگین گرد پوش۔

محسوساتِ ماہر۔ از حضرت ماہر القادری

جذبات کے شعلے، حسن و جمال کے پھول، محبت کے نغمے اور کوثر میں دھلی ہوئی زبان، تڑپتی ہوئی روحوں کے لئے سامان تسکین، سوتے ہوؤں کے لئے تیر و نشتر کیف آور نظموں اور وجد آفریں غزلوں کا مجموعہ۔ (یہ دوسرا ایڈیشن ہے)

قیمت تین روپیے

سیاست جاپان۔ از علی امام بلگرامی ایم۔ اے۔ ۱۰/

جنگ اور روپیہ۔ از امتیاز حسین خاں بی۔کام ۱۰/

اقبال کا تصور زمان و مکان۔ از ڈاکٹر رضی الدین۔ ۱۲/

جناح کے خطوط اقبال کے نام۔ ۵/

اِدارۂ اِشاعت اُردو۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

نوٹ کر لیجئے
گگنئے
۱
۲
۳
نکسول
اسپیشل نکسول
امریکن سکس کریم
نِکسول
کا استعمال کرنا تمام مردانہ کمزوریوں کا مکمل زود اثر اور دیرپا علاج کر لینا ہے
اسپیشل نِکسُول
کا استعمال یہی رکھتا ہے کہ آپ نے اپنی جوانی کا بیمہ کرا لیا ہے اور بیمہ بھی کیسا کہ آج پالیسی کی
رقم داخل کیجئے اور ابھی اسی وقت مع نفع کے وصول کر لیجئے۔ جو لوگ نکسول یا اسپیشل
نکسول کے ساتھ طلاء
امریکن سکس کریم
طلاء کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ وہ بالکل صحت یاب ہو جاتے ہیں۔
آزمائش شرط ہے
خط و کتابت اور
وی پی کا پتہ
نیشن اینڈ ایلس اسپکٹ چیمبرس انیکس فورٹ بمبئی!!

ماہنامہ
پیامِ ادب

ادارۂ اشاعتِ اردو
عابد روڈ حیدرآباد (دکن)

ہمارے ہاں کا تازہ ترین بافتی ذخیرہ جس میں بہتر سے بہتر ملکی و صنعتی پارچہ جات ہیں!
پردہ نشین خواتین کیلئے خاص انتظام
بالکل صحیح نرخوں کی گارنٹی
اکبر برادرس
عابد روڈ
حیدرآباد دکن
ٹیلیفون نمبر ۳۲۱۸

ماہنامہ

پیام ادب

جلد (۱) ماہ ستمبر سنہ ۱۹۴۳ء نمبر (۱)

مدیر مسئول

سید عبدالوہاب

زیر نگرانی

فصیح انصاری

مینیجنگ ڈائرکٹر

چودھری اقبال سلیم گاہندری

ناشر

ادارہ اشاعت اردو

عابد روڈ۔ حیدرآباد (دکن)

چندہ سالانہ چھ روپے

فی پرچہ آٹھ آنے

مطبوعہ نظام اسٹیم پریس

مندرجات

نظرات

وقت آن ست کہ آئین دِگر تازہ کنیم
لَوحِ دِل پاک بشوئیم و ز سَر تازہ کنیم (علامہ اقبالؒ)

پچاس سال کی مدت ایک "ملک" کی ترقی کے لئے کوئی ایسی بڑی مدت نہیں، مگر حیدرآباد دکن، نے اس قلیل مدت میں ارتقا کی اتنی منزلیں طے کی ہیں کہ ان کا شمار بھی کچھ وقت چاہتا ہے۔

یہ پچاس سال، دو مقدس فرماں رواؤں کے مقدس دورِ حکومت کا مقدس بار اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں۔ عہد محبوبی کی بہار آخری اور عہد عثمانی کی نئی نویلی، تازہ و نو رس بہار اسی نصف صدی کے سبزہ زاروں میں ایک دوسرے سے گلے ملیں اور ان دونوں کے "اختلاط" نے بقول علامہ اقبال رح "گلستاں زادوں" میں ایک زندہ، تابندہ، اور پائندہ حیات کے فصول کا شعور پیدا کر دیا۔ ایسا شعور جس پر اس دور کے "دانش و فرہنگ" کا متکبر دیوتا بھی "انگشت بدنداں" ہونے پر اپنے کو مجبور پا رہا ہے۔ اس نیم صدی کا

"افسانہ کامرانی" گو "گیسوئے دوست" کی طرح دراز اور "لعل نگار" کی طرح "لذیذ" ہے مگر ادائے فرض، کی مصروفیت "لذت طلبی" کو مانع اور دستِ مدعا کی کوتاہی "درازیٔ گیسو" کی "پیمائش" سے قاصر ہے۔

دلنواز کہانی۔

تاہم یہ "دلنواز کہانی" پوری نہ سہی "ادھوری" ہی لیجئے

آج سے پچاس سال قبل حیدرآباد دکن نے دوسرے ممالک کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھا تو اس نے محسوس کیا کہ ہر ملک "تنازع للبقا" اور "جہد للحیات" کے میدان جنگ میں اتر آیا ہے۔ جستجوئے زندگی کی راہ میں زندگی کا خون بہایا جا رہا ہے۔ اور حیات کی بلندیوں پر فائز ہونے کے لئے کتنے ہی "نشیبوں" سے گزرنے کا عمل تیزی سے جاری ہے۔ اب زندہ رہنے کا حق اسی کو حاصل ہوگا جس میں زندہ رہنے کے لچھن ہوں گے اور جو اپنی حیات کے اسباب او

زندگی کے موجبات کے آپ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگا۔ ورنہ ممکن نہیں کہ لوحِ روزگار پر اُس کا نقشِ وجود محو ہونے سے بچ جائے۔ وہ صفحۂ حیات سے حرفِ غلط کی طرح مٹ کر رہے گا۔

چنانچہ اُس نے زندگی کو نہ صرف باقی بلکہ اُس کو "جاوداں" بنانے کے لئے ظفر مندانہ ولولہ و جوش کے ساتھ ایک "مہم" شروع کی اور اُس مہم میں اُسکا ہر لحظہ "پیہم وواں" اور ہر دم "رواں" ہوا۔ بالآخر چند سالوں کی پیہم کوشش و کاوش نے اُسے ایک ایسی زرّین وادی" میں لااُتارا۔ جو اپنی نظر فریبی اور دل آرائی میں "فردوس حیات" کا ایک آراستہ خطّہ ہے۔

سیّد عبدالقادر رحمۃ اللہ مرحوم

وہ قافلہ جو دکنِ عزیز کی "حیاتِ دائم" اور "زندگی باوقار" کا سُراغ لگانے اور بالآخر اِس گوہر نادر سے اپنے دامنِ جستجو کو مالا مال کرنے میں کامیاب ہوا چند ایسی ممتاز ہستیوں پر مشتمل تھا جنھیں دکن کا "مورخ" کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ انھیں میں ایک ہستی تھی جسے دنیا نے "سید عبدالقادر" کے نام سے پکارا۔ اِس نے بھی یہاں کی "معنوی ترقی" میں نمایاں حصہ لیا۔ اُس نے دیکھا کہ کسی ملک کی بہبود اور فلاح کا تمام تر انحصار اُس ملک کی نئی پود پر ہے جو "حال" کی امانت دار اور استقبال کی پرورد گار ہے یہ نئی پود جیسی کچھ ہوگی ویسا ہی وہ اپنا اور اپنے ملک کا مستقبل تعمیر کرے گی۔

اِس خیال کے تحت وہ اس صف میں شامل ہوگیا جو اپنے "فرماں رَوا" کے سمجھائے ہوئے طرزِ عمل اور بتلائے ہوئے نقشۂ کار کے مطابق ایک جدید حیدرآباد کی تعمیر میں مصروف تھی گویا یہ دکنِ جدید کے معماروں کی وہ مبارک جماعت تھی جس کی فکر و نظر کے ہاتھوں علم و تہذیب کی اساس پر اِس مملکت کی ازسرِنو تعمیر عمل میں آئی۔

اِس عالی ہمت سید نے اِس راہ کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے اور ماحول کے مطالبات کو بالکل برمحل سمجھتے ہوئے ایک "کتب گاہ" قایم کی جس میں اُس نے "نونہالانِ دکن" کی خاطر ملک اور بیرونِ ملک کی درسی اور غیر درسی کتابوں کو یکجا کردیا۔ یہ ایسا وقت تھا جب ملک کی ضرورت کے مطابق بروقت کتابوں کا ملنا اور چشمِ مجنوں کا جلوۂ لیلےٰ سے متمتع ہونا۔ گویا بالکل مرادف تھا۔ یہاں کوئی ایک ایسا ادارہ نہ تھا جو ملک کی ضروریات کا صحیح اندازہ لگا کر کتابوں کا ذخیرہ فراہم کرتا۔ یہ "دوکان" گویا اپنی خصوصیات کے ساتھ حیدرآباد میں سب سے پہلی "دوکان" تھی جو درسی اور غیر درسی کتابوں کی عام بڑھتی ہوئی تشنگی کو تنہا دعوتِ سیرابی دے رہی تھی۔

اعظم اسٹیم پریس

چند دنوں کے بعد یہاں کے بڑھتے ہوئے "مذاقِ علم" نے شدت کے ساتھ محسوس کرایا کہ تا وقتیکہ ایک وسیع پیمانے پر "لیتھو پریس" نہ قایم کیا جائے بروقت اچھا اور افادی لٹریچر ملک کو نہیں مل سکتا

چنانچہ ۱۸۹۹ء میں سید صاحب نے ایک مرکز طباعت بھی قائم کیا جس نے ملک کے رجحانات، اور مطالبات کے عین مطابق اچھے سے اچھا، درسی اور غیر درسی لٹریچر، اچھی سی اچھی طباعت سے آراستہ کرکے بکھیر دیا۔ کہ اب کوئی پائے جستجو "خار ناکامی" سے مجروح نہ ہوسکے

ان جلیل القدر خدمات ملک وملت کے اعتراف میں از راہ قدر افزائی ۵ ربیع الاول شریف ۱۳۴۱ھ میں تاجدار دکن (خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ) نے ایک فرمان واجب الایقان کی وساطت سے اس مطبع کو ولیعہد دولت آصفیہ نواب والاشان شہزادہ اعظم جاہ بہادر کے اسم گرامی پر اعظم اسٹیم پریس کا وہ نام عطا فرمایا جس پر رہتی دنیا تک سید صاحبؒ کے خاندان کا ہر فرد فخر محسوس کرے گا۔

سید عبدالرزاق و سید عبدالوہاب۔

سید صاحب رح ۱۹۳۵ء میں ملک وملت کی یہ "علمی امانت" اپنے فرزندان سید عبدالرزاق اور سید عبدالوہاب صاحبان کو ہمیشہ کے لئے سونپ کے "رفیق اعلیٰ" سے جا ملے (رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ)۔

سید عبدالرزاق صاحب قدرت کی عطا کی ہوئی تمام صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے اس مرکز طباعت کو دن دونی رات چوگنی ترقی دیتے چلے گئے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج اعظم اسٹیم پریس جنوبی ہند میں لیتھو کا عظیم ترین مرکز ہے اور اس کا شمار ہندوستان کے صف اول کے پریسوں میں کیا جاتا ہے۔ یہ مطبع نہ صرف یہ کہ طابع کتب درسیہ (ایجوکیشنل پرنٹر) ہی ہے بلکہ غیر درسی اعلیٰ درجہ کی کتابوں کی نشر و طباعت میں بھی اس نے وہ خصوصیت حاصل کرلی ہے جس میں اس کا کوئی عدیل نظر نہیں آتا۔ اس نے نہ جانے کتنی ایسی کتابوں کو زندہ کرنے اور ان کو ہمیشہ زندہ رکھنے کی سبیل پیدا کردی ہے جو "امتداد زمانہ" کے ہاتھوں تقریباً اپنا وجود محو کرچکی تھیں مثال میں "تمدن عرب" ہی کو لیجئے جسے اگر یہ مطبع بروقت شایع نہ کردیتا تو کیا کہا جاسکتا ہے کہ اس "گرامی مرتبت" کتاب کی برکات سے دنیا اور کتنی مدت محروم رہتی۔

مولوی سید عبدالوہاب۔

یہ مولوی سید عبدالرزاق صاحب کے حقیقی بھائی ہیں۔ جو اپنے برادر مکرم کے ساتھ گرم عمل ہیں۔ ان کے بے مثل سلیقہ کار اور بے نظیر قوت نظم نے ان کو سید عبدالرزاق صاحب کا صحیح معنوں میں دست راست ثابت کردیا ہے۔ اعظم اسٹیم پریس کے "شعبہ نشر و فروخت کتب" کی غیر معمولی خوبیاں آپ ہی کی "توجہات" کی منت کش ہیں۔

اعظم اسٹیم پریس اور مقصد عظیم۔

ایک مقصد کی تکمیل ہمیشہ اس سے بلند تر مقصد کی

تخلیق کرتی ہے۔ چنانچہ مالکان اعظم اسٹیم پریس جب اپنے ایک اہم مقصد میں کامیاب ہو چکے۔ تو ان کے سامنے ایک جدید نقشۂ کار آیا وہ یہ کہ ایک ایسا ادارہ قایم کیا جائے۔ جس کا کام صرف یہ ہو، کہ وہ ہماری ملکی زبان، زبان اُردو، کی احیاء کی مہم میں زیادہ سے زیادہ حصہ لے۔ اور خدمتِ زبان کے پردے میں زبان کو مفلوج کرنے اور خدمت ادب کے حیلے سے "بے ادبی" کی مہلک بیماری کو عام کرنے کی جو کوشش کی جا رہی ہے اُسے معطل کر کے ملک کو بد ذوقی و ذہنی، حادثات میں مبتلا ہونے سے بچا لیا جائے۔ خاص کر اس "دور قہرمانی" میں جب "جنگ عمومی" کی منحوس "گھا گھبی،" میں تمام سعادتیں روپوش ہو کر رہ گئی ہیں۔ اور مادّی حیات کے اسباب وسائل کی طرح معنوی زندگی کے موجبات بھی تقریباً فنا ہوتے جا رہے ہیں۔ اچھا لڑیچر اور افادی ادب، روز بروز سوتا جا رہا ہے، عریاں اور شرمناک مضامین سے ملوث اوراق کے مجموعے جاگ جاگ کر اپنی "مجمل عافیت" ہنگاموں سے "رونقِ بازار" کو دوبالا کرنے میں منہمک نظر آ رہے ہیں کیوں نہ ایک منظم، وسیع اور نتیجہ بخش اسکیم کے تحت، افادی ادب، اور مفید لٹریچر کو نہ صرف زندہ و بیدار رکھا جائے بلکہ اس کی زندگی، کو "پایندگی" اور اسکی "سادگی" کو ایسی "پُرکاری" عطا کی جائے جسکی تقدیس اور دلربائی کے سامنے غیر صالح، متعفن اور مخرب انسانیت لٹریچر مجبوراً شرمندہ ہو اور ہمیشہ کے لیئے فنا ہو جائے۔

ادارۂ اشاعت اُردو" اور چودھری اقبال سلیم صاحب گاہندری،

اِس مقصد مقدس کی تکمیل کے لیئے جو راہ اختیار کی گئی وہ ادارۂ اشاعت اردو کے نام سے موسوم ہے۔ یہ ادارہ ملک کی بدمذاقی کے خلاف ایک "لرزہ افگن" چیلنج ہے۔ اس سے مدعا یہ ہے کہ ملک کے سامنے ایسا افادی، ایسا زندگی پرور، ایسا جوان اور مضبوط، لٹریچر پیش کر دیا جائے جس کی عظمت و معصومیت کی تاب نہ لا کر غیر افادی، مرگ نواز، نحیف اور مضمحل لٹریچر اپنی موت آپ مر جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ راہ، بڑی کٹھن راہ ہے جس پر چلنا اور چل کر "منزل مطلوب" تک پہونچنا اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک کہ علامہ اقبال کے کلمات میں کوئی "مرد راہ داں" اپنی ندرت رہنمائی سے کام لیکر "قافلۂ جستجو" کو "سلمائے محبوب" کے "دیار جمیل" تک پہنچانے کی زحمت نہ کرے اور اس راہ کے ایک ایک "گام" کے نشیب و فراز سے واقف ہستی، اپنے تجارب، کی روشنی میں پیچھے آنیوالے لوگوں کو بر وقت خطرات سے آشنا اور مستقبل کے "مناظر و مشاہد" سے مطلع کرتی نہ چلے

چنانچہ، بخت و اتفاق کے ہاتھوں، اعظم اسٹیم پریس کو بالآخر ایک "مرد راہ داں" مل ہی گیا۔ ہماری مراد چودھری اقبال سلیم گاہندری سے ہے جن سے دنیائے ادب کا تقریباً ہر فرد بخوبی واقف اور جن کے "خصوصیات کمال" سے ہر قریب و بعید بقدر علم و خبر آشنا ہے وہ ہمارے "شاعر زندگی" کے لفظوں میں نوجوان و شل پیران پختہ کار کے مصداق نظر آتے ہیں۔ اون کے ذوق ندرت، اور عزم فولادی نے کتنے ہی اداروں کی تخلیق کی، ان کو گہوارۂ طفلی میں تھپکیاں دے دے کر، اور دلنواز، لوریاں سنا سنا کر شعور کی

حدود سے گزارتے ہوئے شباب کی رنگین اور دلفریب وادی میں لا اتارا اگر وہ خطرات و سانحات کی نظر بد سے اپنے کو بچا سکے تو یقیناً کبھی نہ کبھی، منزل لیلےٰ کا سراغ پا ہی جائیں گے۔

غرض یہی اقبال سلیم ہیں جن کے دست اعجاز میں اس ادارہ کی عنان دیگئی ہے۔ قوی توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنی بے مثل فنانی (آرٹ) سے اعظم اسٹیم پریس کے مالکوں کے سینے میں پرورش پانیوالی سعید آرزوؤں کو بر لانے میں اپنی دیرینہ روایات کو اور زیادہ تابناک کرینگے۔

اس ادارہ کی بنیاد مالکان اعظم اسٹیم پریس کے مبارک ہاتھوں سے ابھی چند ماہ قبل نومبر ۱۹۴۲ء میں پڑی۔ ابھی پورا ایک سال بھی نہیں ہوا مگر اس قلیل عرصہ میں دو درجن سے زاید ایسی کتابیں طباعت کی خاموش خلوتوں سے نکلکر پبلشاروں کی ہنگامہ آفریں فضاؤں میں آچکی ہیں جن میں سے ایک ایک کتاب ایسی ہے کہ اگر اس مدت میں تنہا وہی شائع کی جاتی تو بھی ادارہ کی منزلت کا پرچم بلند کرنے میں کافی تھی یہ کتابیں اکثر ایسے ثریا رفعت مصنفین کی ہیں جو ادب علم و ادب کے "سموت" ہونیکی حیثیت رکھتے ہیں جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر ایک مستقل مقام رکھتا ہے جنکی "جنبش خامہ" کے ساتھ پوری قوم کی حسین زندگی خراماں، اور ملک کا شاندار مستقبل رقص کرتا نظر آتا ہے۔

دس ماہ کی قلیل مدت میں جن بلند پایہ کتابوں سے اس کم عمر ادارے نے علم و ادب کے ذخیرے میں بیش بہا اضافہ کرنیکی سعادت حاصل کی ہے وہ یہ ہیں

مولنا عبدالماجد دریابادی مدیر صدق۔ (۱) مضامین عبدالماجد (۲) محمد علی (۳) مردوں کی مسیحائی (۴) مقالات عبدالماجد (۵)

احمد ندیم قاسمی (۱) گرداب (۲) سیلاب۔ (۳) انگڑائیاں۔

ڈاکٹر شفیق رحمن۔ (۱) لہریں۔ (۲) پنکھڑیاں

رئیس احمد جعفری۔ (۱) زندگی کے نئے زاویے (۲) مقالات محمد علی حصہ اول (۳) مقالات محمد علی حصہ دوم (۴) حیات شوکت علی

عبدالقدوس ہاشمی۔ (۱) یقین و عمل (لیفا اینڈ ایکشن کا آزاد و روان ترجمہ) (۲) اقبال کا فلسفہ خودی۔ (۳) آثار اقبال۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری۔ ادب اور انقلاب۔

ڈاکٹر رضی الدین جامعہ عثمانیہ۔ اقبال کا تصور زمان و مکان۔

ڈاکٹر یوسف حسین " "۔ روح اقبال

ساغر نظامی۔ رنگ محل

علی امام بلگرامی۔ ام۔ اے سیاست جاپان

امتیاز حسین خاں بی۔ کام۔ جنگ اور روپیہ

ماہر القادری۔ محسوسات ماہر (۲) نغمات ماہر

علی اختر۔ ("اسرار")

خورشید احمد جامی۔ ادب اطفال کے سلسلہ میں چھ کتابوں کا حسین اور دلکش مکمل سٹ۔

مستقبل کا لائحہ کار۔ خواب ادب کی تعبیر

ادارہ نے یہ حیرت آفریں خدمات ایسے ہمت شکن اور صبر آزما زمانے میں انجام دی ہیں جب "امکانات طباعت" کے دروازے پر جنگ کے "خونیں دیوتے" "قفل آہنی" چڑھا دیے ہیں جن کے توڑنے میں آہنی دست و بازو کے زیاں کے سوا اور کچھ حاصل نہیں۔ اگر یہ شدید ترین موانع، آڑے نہ آتے تو کون کہہ سکتا ہے کہ ادارہ کی وسعت عمل کے صحیح وزن کے لیے فکر و نظر کی کتنی "جسیم ترازو" درکار ہوتی۔

بہر حال قدم قدم پر موانعات کی دیواریں کھڑی ہونے کے باوجود انشاءاللہ اس ادارہ کا کاروان خدمت برابر تیز گام رہے گا۔ وہ جتنی آگے

ہر سدِ راہ کو اپنے تیشۂ عزم سے پارہ پارہ کرکے اپنا راستہ آپ پیدا کرے گا، اُس کا عزم، جواں ہے اُوس کے قدم رواں ہیں، رواں ہی نہیں بلکہ دواں ہیں۔ وہ ایک نہ ایک روز ملک کے سامنے خوابِ ادب کی صحیح ترین تعبیر پیش کرکے رہے گا۔ اُس نے اپنا ایک "ارتقائی موقف" متعین کرلیا ہے جس تک اُسے بہرعنوان نہ صرف خود پہنچنا بلکہ اُس کاروان کے کاروان کو پہونچانا بھی ہے جو منزلِ مقصود کی جستجو میں اپنی بے بصیری، اور ناآشنائی کی وجہ سے اب تک بھٹک رہا ہے۔

"پیام ادب"

چشم بکشائے اگر چشم تو صاحبِ نظر است
زندگی در پئے تعمیرِ جہانِ دگر است (اقبالؒ)

"جہانِ دگر" کی تعمیر کی راہ میں یہ "صحیفۂ ادب بقدرِ ذوق وطاقتِ خدمت انجام دینے کے لیئے "بارگاہِ رد و قبول" میں حاضر ہوا ہے اس کے وظائفِ عمل میں اُن مقاصد کی اشاعت ہے جو ادارۂ اشاعتِ اردو کی تاسیس میں مرکوز ہیں۔ یہ ملک میں ذوقِ سلیم کا منّاد، اخلاق کو بلندتر اور پاکیزہ تر بنانے والے ادب کی ترویج کا مُبلغ، اور ترقی پسند ادب کے پردے میں مذہب کو شکست دینے کے لیئے حیا اور عفت کو ذبح کردینے والے عناصر کو ایک پرجوش، قوی اور غالب مجاہد کی حیثیت سے، رونما ہوا ہے۔ شمارۂ آیندہ میں مزید ضیاء وضاحت سے صفحات کو بافروغ بنانے کا عزم ہے۔ اِس لیئے انھیں چند کلمات پر اکتفا کی جاتی ہے۔

خرم آنکس کہ دریں گرد سوارے بیند
جوہرِ نغمۂ ز لرزیدنِ تارے بیند

سرور پیپر ملز لمیٹڈ

ایسے وقت میں جب زندگی نایاب اور اسبابِ زندگی نایاب تھے ہوگئے ہیں ایک ایک تختۂ کاغذ گویا دامنِ حور بن کر رہ گیا تھا جس کا ہاتھ آنا اِس جہانِ فانی میں ممکن نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ملک کی خوش قسمتی سے سرور پیپر ملز، کا قیام ایسے ٹھیک وقت پر عمل میں آیا۔ جب اخبارات۔ رسائل۔ اورکتب کی دُنیا میں موت کا سناٹا چھا رہا تھا۔ اِس کاغذ سازمِل، نے تحریر وقلم کی دنیا کو مرنے سے بچا لیا۔

ہم اِس سلسلے میں جناب میر لائق علی صاحب جنرل ڈائرکٹر سرور ملز کے بے حد مشکور ہیں کہ اُن کی مسیحائی نے ملک کو از سرِ نو، مژدۂ حیات سنایا۔ اور اُن کی نوازشوں نے طباعت واشاعت کے بیڑے کو غرق ہونے سے محفوظ کرلیا۔ میر صاحب موصوف تمام ملک کے مخلص ترین شکریوں کے مستحق ہیں۔

اِس کے ساتھ ہی ہم جناب مولوی عبدالباسط صاحب سیل منیجر اور جناب مرزا جاوید بیگ صاحب اسِسٹنٹ کے خدمت میں بھی ہدیۂ اِمتنان پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں جن کے اخلاق برتر نے ہم سب کو اپنا گرویدہ بنالیا ہے اور ہماری ہر دشواری کو آسانی کا درجہ عطا کر دیا ہے۔

(ادارہ)

اُردو اَدب کے جدید رُجحانات

۱۹۳۳ء تا ۱۹۴۳ء

از جناب ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

پچھلے دس سال سے اُردو اَدب میں تیزی سے تبدیلیاں ہو رہی ہیں اور تغیر کی یہ رَو مسلسل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ روایت اور تقلید سے اَدب اور اَدیب اِجتہاد اور تجربہ پر کمربستہ ہوگیا ہے اور پرانی قدروں کو رد کر کے وہ نئی قدروں کی تلاش میں نکل پڑا ہے چنانچہ اُردو اَدب کے موجودہ دَور کو تغیر اور تجربہ کا دَور کہنا مناسب ہوگا۔

انگریزی کو چھوڑ کر فرانسیسی اور روسی اَدب سے شناسائی، ہندی گیت کا اثر، ملک کا بڑھتا ہوا سیاسی شعور اور سیاسی تحریک کی عوام سے وابستگی "عورتوں کے دیدار کا اِمکان" —— اِن سب چیزوں نے مل جل کر شاعر اور اَدیب کے خیال و قلم کو بہت متاثر کیا۔ نیاز فتحپوری، سجاد انصاری اور قاضی عبدالغفار کی تحریروں نے اُردو کے مزاج سے مولویانہ تعصب کو کم کر کے نئے خیالات و تجربات کے لیے راستہ صاف کیا۔ اِسی طرح اختر شیرانی نے عورت کو مخاطب کر کے مجازی عشق کو شرافت کی وہ سند دلائی جس سے "زہرِ عشق" کا شاعر محروم رہ گیا تھا۔

یہ مختلف عناصر اَدب کے اِحساس میں ہیجان پیدا کر چکے تھے کہ "انگارے" کی اِشاعت نے بارود خانے میں چنگاری کا کام کیا اور تعصب و تقلید کی بوسیدہ قبا میں آگ لگ گئی۔ اِس کے بعد نثر و نظم دونوں میں یک بیک تخلیقی تجربوں کا بھونچال سا آگیا۔ اُن میں اِضطراب کا پہلو اپنا نمایاں

تھا کہ مختلف رجحانوں کو اَدبی مدرسوں کی شکل اختیار کرنے کی مہلت نہ ملی بلکہ تخلیق اور اشاعت کی باہمی رقابت نے اُن میں سے اکثر میں سہل نگاری کا وہ نقص پیدا کر دیا جو ادبِ جدید کے دامن کا بہت بڑا داغ ہے اس کی بڑی خوبی تنقید کی صلاحیت اور بڑا عیب فکر و مشاہدہ کی کمی ہے۔

ان میں سب سے اہم اور موثر ترقی پسند اَدب کی تحریک ہے۔ اس کے فروغ میں حسب ذیل واقعات قابل ذکر ہیں۔ آخری عمر میں پریم چند کے آرٹ کا انقلاب۔ اقبال کی رحلت۔ "اَدب اور زندگی" کی اشاعت ترقی پسند مصنفین کی انجمن کا قیام۔ قاضی نذرالاسلام کی نظموں کے تراجم۔ یہ تو کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ ملک کی روز افزوں اشتراکی تحریک سے یہ اَدبی رو براہِ راست متاثر ہوئی۔

اِس تحریک کی اہمیت یہ ہے کہ اُس نے اَدب میں زندگی کا تنقیدی احساس پیدا کیا اور قدروں کو جانچنے کے لیے ادیب کو ایک سماجی معیارِ فن سے آشنا کیا۔ کیونکہ ترقی پسندی اور حقیقت نگاری میں چولی دامن کا ساتھ ہے اس لیے زبان عالمانہ تکلف سے ہٹ کر عامیانہ صفائی کی طرف مایل ہونے لگی۔

ترقی پسند نظریۂ اَدب بھی اِس حقیقت کے آگے مجبور ہے کہ سماجی ماحول اس سے بہت پیچھے ہے۔ اور ہندوستانی سماج بیک وقت تاریخ کے مختلف دوروں سے گزرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایک طرف نشاۃِ ثانیہ کی تحریک ہے جو ادب کو "کلاسکل دَور" کی طرف لے جاتی ہے، دوسری طرف آزادی کی جنگ ہے جس سے رومان کا رجحان وابستہ ہے، تیسری طرف سماجی انقلاب کا پرچار ہے جو حقیقت نگاری کا محرک ہے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جو اپنے آرٹ کو انقلاب، اشتراکیت یا ترقی کا مظہر سمجھتے ہیں، آپ اپنی تحریر میں اُن کا اظہار کرنے میں پُوری طرح کامیاب نہیں ہوتے۔ اس کے لیے اُنھیں دشنام دینا حماقت ہے۔

ترقی پسند شاعروں میں سب سے زیادہ مقبولیت جوؔش کو حاصل ہوئی اُس کا خاص جوہر اس کی رجائیت ہے جو اس اندھیری دنیا میں بھی انسان کو یقین دلاتی رہتی ہے کہ اس کا مستقبل رَوشن ہے۔ یہ بھی ہے کہ اُنھ یا اس کے ساتھیوں نے پیرایۂ اظہار میں کسی تجربہ کی کوشش نہ کی اور اس طرح ایک عام

اِعتراض سے بچ گئے۔ یہ بات یاد رکھنا ہے کہ شراب و شباب کی محبت جوشِ اِسکول کو ترقی پسندی کی طرف لے گئی ہے اور اس پر اَب بھی ہیئت کا رنگ گہرا ہے گو کہ اس میں تنزل کی کیفیت باقی نہیں رہی۔

یہ اُمر نہایت دلچسپ ہے کہ یو۔پی کا اَدیب یا شاعر ٹیکنیک یا اُسلوب میں تجربہ کی طرف نہیں جاتا۔ اور اِس قسم کی تمام کاوشیں یو۔پی سے باہر خصوصاً پنجاب میں ہوتی رہی ہیں اس کا سبب شاید یہ ہے کہ پنجاب میں تمدنی روایتوں کی عمر نسبتاً بہت کم ہے۔ اور وہاں جس کثرت سے پیغمبروں کا ظہور ہو سکتا ہے اسی آسانی سے اَدبی مجاہد اُبھر سکتے ہیں۔

پنجاب میں ترقی پسند شاعری کا زیادہ چرچا نہیں ہوا۔ لیکن وہاں سے ایک بہت اہم رُجحان کا آغاز ہوا ہے جس کا اِظہار نظمِ جدید کے ذریعہ ہو رہا ہے۔ جس میں با قافیہ اور بے قافیہ کے علاوہ نظمِ آزاد بھی شامل ہے جدید نظم کی خصوصیت اس کی اِشاریت پرستی ہے۔

قافیہ پیمائی کو چھوڑنے یا بحر کے روایتی اِستعمال کو بدلنے کا خیال نیا نہیں۔ آج سے ستر سال پہلے علی گڑھ گزٹ نے شاعروں کو اس طرف متوجہ کیا تھا۔ اسمٰعیل میرٹھی اور نادر کاکوری نے اودھر رخ بھی کیا۔ پھر عظمت اللہ مرحوم نے اپنے خاص انداز میں جدید نظم کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ لیکن ہندی بحر اور زبان کا اثر شاعری کو اس کے اصلی راستہ سے ہٹا کر 'گیت' کی طرف لے آتا ہے اور اُس میں کسی عمیق خیال کے اِظہار کی صلاحیت باقی نہیں رہتی " ہندوستانی " کی حیثیت اس وقت نصب العین کی ہے۔ ابھی نہ وہ نثر کی فصاحت کی خوگر ہے اور نہ نظم کی بلاغت کی متحمل۔

اِقبال کی رحلت کے بعد ان کی شاعری کا اَثر گھٹنے اور فلسفہ کا اثر بڑھنے لگا پنجاب میں جدید نظم کی تحریک نے اِشاریت کا سہارا لے کر زور پکڑا اور اُردو میں ایک ایسے رُجحان کی بنا پڑی جو فنی اِعتبار سے دور رَس ہے۔ واضح رہے کہ بنگالی اور ہندی میں یہ رُجحان پُرانا ہے اور ٹیگور کی وجہ سے اُسے بڑی تقویت حاصل ہوئی۔

خیال کے اِعتبار سے جدید نظم کے ترجمانوں میں کوئی ہم آہنگی نہیں۔ ان سب میں جو شئے مشترک ہے وہ کلاسکل شاعری سے ان کا بیزار ہے۔ قافیہ کی آزادی یا عروضی تجربوں سے زیادہ موثر اُن کی یہ کوشش ہے کہ اُردو

شاعری کے روایتی 'محاورہ' میں تبدیلی ہو۔ ظاہر ہے کہ دل و نگاہ کی وسعت کے ساتھ شاعری ایک نئے قالب کی ضرورت شدّت سے محسوس کر رہی ہے۔ موسیقی اور شاعری دونوں کی بنیاد 'تال' پر ہے۔ لیکن جس طرح موسیقی میں راگ راگنیوں کی تعداد مقرر نہیں کی جا سکتی اِسی طرح شاعری میں 'بحر' یا 'محاورہ' کا تعین ناممکن ہے دیکھنا صرف یہ ہے کہ شاعر 'آہنگ' کو اِس طرح باقی رکھتا ہے یا نہیں کہ نظم اور نثر کا بنیادی اِمتیاز باقی رہے۔

جدید نظم میں اِشاریت کا عنصر خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ ہر وہ شخص جسے اَدبی تخلیق کی صلاحیت حاصل ہے یقیناً محسوس کرتا ہوگا کہ جذبات کی وسعت کے مقابلہ میں الفاظ کی دنیا ابھی کتنی محدود ہے۔ خاص طور پر نظم کی پابندیوں میں 'لفظ' کے وسیلہ سے کسی پیچیدہ خیال کا اِظہار کس قدر دشوار ہے۔ اِشارہ اور کنایہ کا برمحل اِستعمال اِس کمی کو پورا کر سکتا ہے۔ علاوہ بر آیں سیاسی اور سماجی پابندیاں آرٹسٹ کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ اپنا مدعا 'اِشارہ' میں ظاہر کرے۔ زار کے زمانے میں روسی اَدب 'اِشاریت' کے دَور سے گزر چکا ہے۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جدید نظم اور ترقی پسندی میں براہِ راست تعلق ہے حقیقت اِس کے برعکس ہے۔ وہ موجودہ ماحول سے بیزار ضرور ہے۔ لیکن یہ بیزاری ترقی کی طرف راغب نہیں ہوتی بلکہ اِبہام اور اِضمحلال کی وادیوں میں بھٹکنے لگتی ہے۔

یوں کہنا چاہیے کہ اُردو شاعری میں یہ رومانی اِنقلاب پسندی اور اِشاریت کا زمانہ ہے۔

موجودہ اُردو اَدب کی دوسری اہم شاخ 'مختصر افسانہ' ہے۔ اَب وہ اُس جمال پرست رومانی دور سے گزر چکا ہے جو آسکر وائیلڈ سے متاثر تھا۔ ہندوستانی نوجوان کی شخصیت کا داخلی تنازعہ ہنوز باقی ہے لیکن صرف عورت کی محبت اُسے تسکین نہیں دیتی۔ اِس کشمکش کی عکاسی 'محبت اور نفرت' کے اِبتدائی اَفسانوں میں مِلے گی۔

اَدب عالم بڑی حد تک حقیقت نگاری اور نفسیات کے دو اِسکولوں میں منقسم ہے ان دونوں رجحانوں کی کارفرمائی اُردو اَفسانے میں نظر آتی ہے۔ حقیقت نگاری بھی اَب پریم چند کی پہلی منزل سے گزر کر اِشتراکی تنقید کی طرف مایل ہو گئی ہے۔ یعنی وہ سماج کے پورے ڈھانچہ میں کایا پلٹ کر دینا چاہتی ہے۔

نفسیاتی افسانے کا مرکز 'جنس' کا مسئلہ ہے، لیکن ابھی اِس میں وہ پختگی نہیں آئی کہ تحلیل نفسی کے اصول سے اِنسان کے تحت الشعور کا اَدبی مطالعہ کرے۔ فکر کی یہ کمی اور اسلوب کا کچا پن افسانہ نگار کو اکثر کجروی کی طرف بھٹکا دیتا ہے جسے عرف عام میں 'عُریاں نگاری' کہتے ہیں۔ ۱۹۰۵ء کے ناکام رُوسی اِنقلاب اور ۱۹۱۷ء کے کامیاب روسی اِنقلاب کے دَرمیان روس میں یہ ہوا عام طور پر چل پڑی تھی اور SANINISM کے نام سے مشہور تھی۔ وہاں ترقی پسند ادیبوں نے اِس رجحان کو ملعون قرار دیا تھا۔
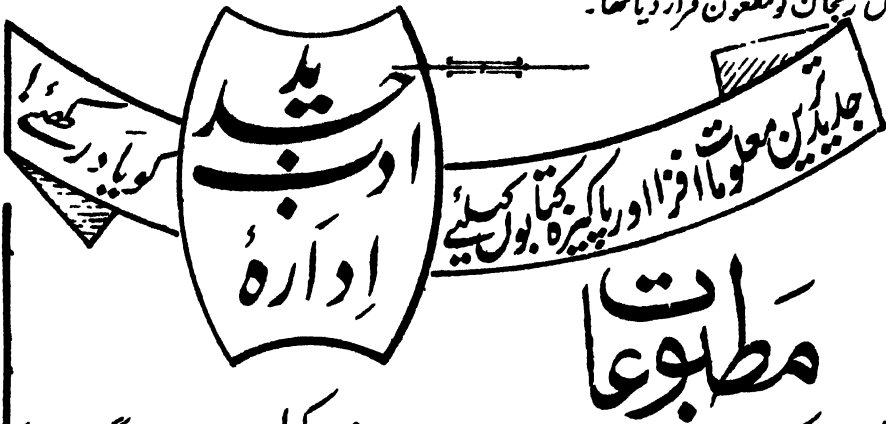
اَب جنگی حالات اور ملک کا سیاسی جمود ادب میں اِضمحلال کی کیفیت اور جنسی کجروی سے اِنہاک کی کیفیت پیدا کر رہا ہے۔ اِس ہیجان اور کشمکش کو محض عارضی سمجھنا چاہیئے۔ اگر یہ دیکھیئے کہ پچھلے دس سال میں اُردو ادب عظمت نہیں تو وسعت کے اِعتبار سے کہاں سے کہاں پہنچ گیا تو یہ یقین ہونے لگتا ہے کہ اُس کا مستقبل بہت روشن ہے۔ اور وہ دن دُور نہیں جب ادب ہند کی رہنمائی کا سہرا اُردو کے ہی سر بندھنے والا ہے۔

آیاتِ جذبات

شاعرِ حیات حضرت ماہر القادری

ہر ذرّہ دِل بن جاتا ہے، ہر چیز نظر ہو جاتی ہے
جس سمت وہ نظریں اٹھتی ہیں، کونین اُدھر ہو جاتی ہے

فرقت کا بھیانک سنّاٹا، ہر سانس میں اِک طوفاں غم کا
میں شکر کے سجدے کرتا ہوں جب رات بسر ہو جاتی ہے

او دیکھنے والے! اِس درجہ گستاخ نہ بن بے باک نہ ہو
اِس طرح لطافتِ جلووں کی مجروحِ نظر ہو جاتی ہے

مانا کہ تغافل کے ہاتھوں پامال بھی ہوں مایوس بھی ہوں
وہ میرے لیے زحمت نہ کریں یوں بھی تو گزر ہو جاتی ہے

تنہائی کے نازک لمحوں میں کچھ تم ہی ستارو! بات کرو
تم نے تو وہ شب دیکھی ہو گی جس شب کی سحر ہو جاتی ہے

ہر سانس میں ہچکی کا آنا، ہر اشک میں اُن کا افسانہ
کیا دل کے دھڑکنے کی ماہرؔ اُن کو بھی خبر ہو جاتی ہے

پلکوں کے سائے

جنابِ احمد ندیم قاسمی۔ بی۔ اے

کل کی بات ہے، میں گھر سے نکلا تو مجھے
راستے میں نند مِل گیا۔ نند میرا دوست ہے، اِشترا کی
خیالات کا بات بات پر کارل مارکس کے مقولے
دُہراتا ہے۔ اُس کے لبوں پر ہمیشہ ایک مغموم سی
مُسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے، جیسے ستارۂ سحری
کسی پتلی سی بدلی کے پیچھے جھلملائے۔
آج وہ کچھ کھویا کھویا سا تھا، آنکھیں
کچھ بھاری بھاری سی معلوم ہوتی تھیں جیسے اُن پر
کوئی تاریک سی جھلی چپکا دی گئی ہے، باتیں مجھ سے
کرتا تھا اور دیکھتا آسمان کی طرف تھا۔ ٹھوڑی
کی گولائی کبھی کبھی بے اِرادہ لرز جاتی تھی۔ میں نے
پُوچھا۔ "نند۔ آج گھبرائے کیوں رہے ہو؟"
بولا "طبیعت مضمحل سی ہے، کل
سے بدن ٹوٹ رہا ہے"
"کیوں؟"
"خوب سوال ہے تمہارا۔ کیا بیمار سے
کبھی یہ بھی پُوچھا جاتا ہے کہ وہ کیوں بیمار ہوا؟"
"ہاں۔ حکیم پُوچھتے ہیں!"
"تم نے یہ حکمت کا سوانگ کب سے بھرا؟"
اور میں نے مُسکرا کر کہا۔ "بھئی ہم روحوں
کے امراض کی جڑ پکڑ لیتے ہیں، میں دیکھ رہا ہوں
کہ تمہارا بدن نہیں ٹوٹ رہا تمہاری رُوح کسی
گہرے سوچ اور سنگین فکر کے نیچے پسی جا رہی ہے
اب معلوم ہوا کہ تم مجھ سے بھی باتیں چھپاتے ہو"
نند جھلا اُٹھا۔ "ہوش کی دوا کرو تم
سے باتیں چھپاتا ہوں میں؟"
"تو پھر میری بات کا جواب دو"
"کیا کرو گے سُن کر؟"
"علاج کروں گا تمہارا"
"علاج ولاج کا تو ذکر ہی نہ چھیڑو کہ
مرض مریض سمیت ختم ہو چکا ہے لیکن خیر تمہیں
ضد ہے تو سنو"

"ہاں"

"پتاجی سے اَن بَن ہوگئی"

"لاحول ولا۔ اِتنے اچھے پتا سے اَن بن۔ کیسے؟"

"وہ کچھ مجھ سے رُوٹھ گئے ہیں۔ اور کچھ میں اُن سے"

"آخر کِس بات پر؟"

"میں نے اُن کی ایک تجویز کی مخالفت کی ہے"

میں نے گھبرا کر کہا "نند۔ بھئی خدا کے لیے کھُول کر اور کھُل کر بات کرو۔ اشتراکی لوگ ہمیشہ صاف اور سیدھی بات کرتے ہیں۔ کوئی لگی لپٹی اُٹھا نہیں رکھتے"

"میں شادی نہیں کرنا چاہتا"

"برہم چاریہ بنے رہنے میں اشتراکیت کا کونسا زرین اُصول پنہاں ہے؟۔ اچھا۔ پھر؟"

"اور وہ کہتے ہیں شادی کرو"

"اور تم روٹھ گئے؟"

"وہ بھی روٹھ گئے!"

"میرا مشورہ ہے کہ من جاؤ"

اُس نے مجھے بازو سے پکڑ لیا اور کمیٹی باغ کی طرف لے چلا۔ کہنے لگا "اِدھر بنچ پر بیٹھ کر باتیں کریں گے!"

سنترے کے ایک درخت کے تنے پر دو ٹنڈے مُنہ بلا کر کھڑے تھے۔ میں نے اُنگلی سے اُن کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نند۔ میرا مشورہ ہے کہ من جاؤ"

وہ مسکرا دیا۔ لیکن اُس کی مُسکراہٹ بہت پژمردہ سی تھی۔ پگڈنڈی پر پڑی ہوئی کلی اگر کسی کے پاؤں تلے آکر چٹک جائے تو کیا خاک لُطف آئے گا۔ یہ مسکراہٹ بھی کوئی مُسکراہٹ ہے! یہ چٹک بھی کوئی چٹک ہے!

——— ہم دونوں اسی سنترے کے درخت کے قریب ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ یہ ایک نیم تاریک سا کنج تھا۔ کبھی کبھی ہوا کا کوئی بھولا بھٹکا جھونکا گنجان شاخوں میں سرگوشیاں کرتا گزر جاتا یا کوئی آوارہ پرندہ ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی پر پھدکتا چراچرا بولتا کہیں اُڑ جاتا سنترے کے درخت کے تنے سے کوئی آدھ فٹ کے فاصلہ پر ایک ننّھا سا گڑھا تھا جس کے دھانے پر ایک مکڑی جالا تن رہی تھی۔ الف لیلہ کا سا ماحول تھا!

نند بنچ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور بولا "سُن سکو گے؟"

میں نے چھاتی پر ہاتھ مار کہا "بھئی ہمارے سینے میں پتھر کا کلیجہ ہے"

بولا "اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں کہ
سن سکو گے؟"
میرا دماغ بھنا سا گیا۔ پوچھا "کیوں
کیا کوئی دردناک داستان ہے؟"
مسکرا کر بولا۔ "مجھے تو بس یہ فکر ہے
کہ تمہیں انور کو بلنا ہوگا۔ وہ بے چاری دریچے
میں کھڑی کھڑی بت بن جائے گی ——— وینس کا!"
میں نے قہقہہ مار کر کہا۔ "وہ کشمیر
چلی گئی ہے۔"
"اور تم؟"
"میں یہاں ہوں"
"ارے محمود! وہ کشمیر میں۔ تم یہاں
یہ کیا بات ہے؟"
"چاند ہمیشہ اکیلے سفر کرتا ہے!"
"کس کی نظم سے یہ خیال اڑایا ہے؟
پتھر کے کلیجے رکھنے والے چاند کی باتیں کیا جانیں"
وہ مذاق کر رہا تھا لیکن مجھے محسوس
ہوا جیسے اس نے میرے غرورِ نفس کے آبگینے
کو ٹھوکر لگا دی ہے۔ میں نے کہا۔ "لیکن اشتراکیت
کے پجاری چاند ستاروں کے راز کیا سمجھیں!"
نند حیران سا نظر آنے لگا۔ شاید
میرے لہجے میں کچھ تبدیلی آ گئی تھی۔ بولا۔
"تو کیا تمہارا خیال ہے کہ اشتراکی خیالات کا
نوجوان شعریت اور محبت سے عاری ہوتا ہے؟"
میں نے کہا۔ "ہاں۔ اشتراکیت اور
شعریت یا اشتراکیت اور محبت دو بالکل الگ
الگ چیزیں ہیں۔ بادِ سموم اور نازک پھول میں
کیا مناسبت ہو سکتی ہے؟"
"لیکن میں نے محبت کی ہے" وہ بولا۔
"تو تم اشتراکی نہیں"
"میں اشتراکی بھی ہوں"
"تو پھر تم نے محبت نہیں کی"
وہ تنگ آ کر بولا "جانے تم لوگوں نے
اشتراکیت کو ہوا سا کیوں سمجھ رکھا ہے! سچی
اشتراکیت کا مطلب ہے بنی نوع انسان کے
ہر ادنیٰ سے ادنیٰ فرد سے محبت"
میں مسکرایا "جی ہاں۔ اس اشتراکیت
پسند مکڑی کا قصہ تو تم نے سنا ہوگا جس نے دنیا
بھر کی مکھیوں اور مچھروں کو اپنے "غریب خانہ"
پر مدعو کیا تھا۔ اور ان سے محبت کا اظہار
کرنے کے بعد دس دنوں کا فاقہ توڑا تھا!"
"لیکن پھر بھی میرا یقین اسی طرح اٹل
ہے کہ اشتراکی صرف محبت کر سکتا ہے"
"عورتوں کی سی ضد ہے تمہاری"
اور نند کو جیسے کسی نے پہلو میں چھرا
مار دیا۔ بجلی کی سی تیزی سے میری طرف پلٹا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے اور گہرے ہو گئے ٹھوڑی کی گولائی دو چار بار لرزی۔ دردناک اور جوشیلی آواز میں بولا "کسی سر پھرے نے یہ محاورہ گھڑا ہے، حقیقت یہ ہے کہ مرد مندی ہوتے ہیں۔ عورتیں بے چاری تو کھلونے ہیں۔ کھلونے۔ جدھر گھماؤ گھوم جائیں۔ جدھر لڑھکاؤ لڑھک جائیں۔ ہم مرد اُن کی آرزوئیں اور اُمنگیں یہ جانتے ہوئے بھی کچلتے رہتے ہیں، کہ اُن کے سینوں میں بھی دل ہیں اور وہ کمبخت دھڑکتے بھی ہیں اور ہمارے دلوں سے وہ زیادہ نازک اور گداز بھی ہیں۔ اور پھر ڈھٹائی دیکھو ہم مردوں کی۔ کہ ہم فخر سے اکڑتے ہیں اور غرور سے تنتے ہیں۔ صرف اِس لیے کہ ہم نے ایک معصوم عورت کی توقعات کو ذبح کر ڈالا ہے تف ہے!"۔۔۔ ۔ اور وہ پلٹ کر پھر اسی طرح آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

میں نے کہا: "لیکن یہ جملہ معترضہ شیطان کی آنت ہوا جا رہا ہے، تم اپنی داستان سُنانا تو بھول گئے"

"یہی تو میری داستان ہے" اُس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"تو بھئی۔ تفصیل سے بیان کرو۔ یہ داستانیں تو میں روز سنتا ہوں تم سے"

گلا صاف کرنے کے لیئے وہ کھنکارا اور بولا۔ "لیکن محمود تمہیں اَنور کا واسطہ۔ اَب مذاق نہ کرنا مجھ سے، دُکھ ہوگا مجھے"

"تسلیم" میں نے اپنے آپ کو سنجیدہ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

نند کہیں دُور دیکھتے ہوئے بولا "میرے بھائی! اشتراکی بھی تمہاری طرح اِنسان ہیں، تم اگر اَنور کی کوٹھی کے دن میں اٹھارہ چکر کاٹ سکتے ہو، تو وہ بھی کملا کے مکان کے سائے تلے ساری ساری رات گذار سکتے ہیں"

میرے دماغ میں دھم دھم سی ہونے لگی، جیسے کہیں دُور دھان کوٹے جا رہے ہیں"

"تمہیں کملا سے محبت ہے؟" میں نے پُوچھا۔

"ہاں"

"مگر یہ کملا ہے کون؟"

"ضبط سے کام لو۔ سب کچھ ایک ہی سانس میں کیوں کر بتا دوں؟۔ پانچ مہینے ادھر کا ذکر ہے۔ میں ملتان سے لاہور آ رہا تھا کیونکہ یہاں میرے چچا ایک فرم میں ملازم ہیں۔ اور پتا جی کا خیال تھا کہ میں اُن کی صحبت میں رہ کر فرم کے اِنتظامی اُمور سے واقفیت بہم پہنچاؤں گا اور پھر اِسی فرم میں ملازم ہو جاؤں گا، اِسٹیشن سے

باہر تانگے میں بیٹھا ہی تھا کہ ایک نوجوان عورت
میرے قریب سے گذری۔ شرمائی نظریں۔ لجائی
چال۔ عین دوپہر کا وقت تھا اور اُس کی دراز پلکوں
کے سائے اُس کے رخساروں سے گزر کر اُس
کی ٹھوڑی تک چلے گئے تھے۔ جہاں ایک ننھا سا
بھنبھر گڑھا کپکپا رہا تھا۔ اُس کی دراز پلکوں
کے سائے میرے دل سوئیوں کی طرح چبھنے لگے
اور مجھے وہ لڑکی اُن رومانی کہانیوں کی ہیروئین
محسوس ہونے لگی جو خانہ بدوش قصہ گو پُرانے
بادشاہوں کے درباروں میں مبالغہ آمیز طوالت
سے دُہرایا کرتے تھے۔

"لاہور ایسے شہر میں اگر ہر عورت کے
متعلق اِس قسم کی خیال آرائیاں شروع کر دی
جائیں تو زندگی اجیرن ہو جائے سو بھئی۔ میں نے
تانگے والے سے کہنا چاہا کہ وہ ٹٹو کے بید جمائے"
مگر اچانک وہ پکار اُٹھا۔ "ہے بی بی جی۔ شہر جانا ہے!
شہر؟ شہر اُتار دوں گا آپ کو"

"وہ لڑکی پلٹ کر کھڑی ہو گئی اور بہت
مدھم آواز میں بولی: "مجھے کرشن نگر جانا ہے۔"

"مجھے بھی کرشن نگر ہی جانا تھا جسم میں
یونہی ایک تھرتھری سی دوڑ گئی"

"تانگے والے نے ٹٹو کے بید جماتے
ہوئے کہا: "چوّنی لوں گا"

"گھٹی ہوئی آواز میں وہ بولی" دوئی
بلے گی۔"

"تانگے والا اِس موقع پر اپنے ہم پیشہ
لوگوں کے مخصوص فقرے دہرا کر آگے نکل جانا
چاہتا تھا کہ میں نے آہستہ سے کہا" ارے دوئی
ہی لے لے۔ دَم بھر کے لیے تانگے میں شمع
جلا لے!"

"کم بخت پلٹ کر مسکرایا۔ اور پھر پکارا۔
"آجاؤ بی بی جی!"

"وہ بولی۔ لیکن میں بیٹھوں کہاں؟"

"میں نے کہا" آپ پیچھے بیٹھ جائیں۔
میں آگے ہو جاتا ہوں"

"میں آگے ہو گیا۔ وہ پیچھے بیٹھ گئی۔
یوں ہماری پہلی ملاقات ہوئی!

"بہت دیر تک تانگے والے کی ٹخ ٹخ
اور ٹٹو بچو کے سوا میرے کان میں کوئی آواز نہ آئی
ہاں دل و دماغ میں احساسات کے بادل کڑک
رہے تھے۔ میں سوچنے لگا۔ یہ کس قسم کے خیالات
کی عورت ہے کہ اِس عمر میں ایسے پُرانی وضع کے
کپڑے پہن رکھے ہیں۔ کانوں میں ایک آویزہ
تک نہیں اور پھر تانگے والے سے گفتگو کرتے وقت
اُس کا انداز گفتگو کس قدر شرمیلا تھا۔ اور آنکھیں
کس طرح زمین پر گڑی ہوئی تھیں! اور میں کس قدر

بے وقوف ہوں کہ بغیر سوچے سمجھے آگے ہو بیٹھا
میں پیچھے ہوتا اور وہ آگے ہوتی تو کم از کم اُس کے
اُن بالوں کو تو دیکھ سکتا جو اُس کے سفید ڈوپٹہ
میں سونے کے تاروں کی طرح چمک رہے تھے
اور شاید مجھے اس کی پلکیں بھی نظر آجاتیں۔ وہ
دراز پلکیں اور اُن کے وہ دراز سائے! اس
کے بے داغ رخساروں پر چھائے ہوئے
دراز سائے!

میں اس خوف سے آگے جھک کر
بیٹھا تھا کہ اگر بے جانے بُوجھے میرا جسم اس کے
جسم سے چھو گیا تو ــــــــ! میرے جسم میں یونہی
ایک تھرتھری سی دوڑ گئی!

اچانک اُسی کی آواز میرے کانوں
میں گونجی۔ وہ تانگے والے سے کہہ رہی تھی: "بھائی
میں اڈے پر نہیں اُتروں گی۔ ایک محلے میں
جاکر اُتروں گی میں۔"

تانگے والا بیڑی کا کش لگاتے ہوئے
بولا: "جہاں جی چاہے اُتر جانا بی بی جی۔ آپ ہی کا
تانگا ہے!"

اور اُس وقت جو میں نے مسکرا کر
پیچھے دیکھا ہے تو اُس کے چہرے پر جیسے شفق
پھول رہی تھی۔ کھسیانی سی مسکراہٹ اُس کے
لبوں پر کھیل رہی تھی جن کے گوشے گاہے گاہے
لرز جاتے تھے اور اُس کی پلکوں نے اُس کی آنکھوں
کو ڈھانپ لیا تھا۔ اُس نے شاید محسوس کر لیا تھا
کہ میں اُس کی طرف دیکھ کر طنزاً مسکرا رہا ہوں۔
اُس نے اپنی آنکھوں کے گوشوں سے میری طرف
دیکھا اور میں سمجھا جیسے دو چنگاریاں لپک کر
میرے کلیجے میں گھس گئی ہیں!

اب ہم سرکلر روڈ پر جا رہے تھے۔
میں بہت دیر تک سامنے دیکھتا رہا۔ اور آخر
پیچھے دیکھے بغیر بولا: "آپ کس جگہ اُتریں گی؟"

اُس نے نہایت مدھم آواز میں جواب
دیا: "سدا نند گلی میں۔"

میں نے کہا: "مجھے بھی وہیں جانا ہے۔
سدا نند میرے چچا ہیں۔"

اُس نے شاید تعجب سے میری طرف
دیکھا۔ کیونکہ پلٹتے ہوئے اس کی کہنی میری پسلیوں
سے ٹکرا گئی اور میں سمجھا جیسے ہم تانگے اور ٹٹو
سمیت شیشم کے درختوں کی آخری پھننگوں کو
چھوتے ہوئے ہواؤں میں تیرتے جا رہے ہیں
بہت مشکل سے میں نے اپنے آپ کو سنبھالا
میں بہت جذباتی واقع ہوا ہوں اور اُس کی وجہ
اشتراکیت کا مطالعہ اور وہ روحانی افلاس ہے
جس سے مجھے پچھلے پانچ سال تک دوچار رہنا
پڑا۔ گذشتہ پانچ برس میں مَیں اس اُمید پر

گزارے کہ پتاجی کو میرے لیے آخر کوئی لڑکی تو
ضرور پسند آجائے گی لیکن وہ شاید قارون کی
صاحبزادی کے متلاشی ہیں۔ اُنھیں اپنے مقصد
میں کامیابی نہیں ہوئی۔ مجھے اپنا مدعا نہیں ملا۔
پانچ سال کے رُوحانی افلاس کے بعد اگر اچانک
روح کسی نازک سی کہنی سے جاگ اُٹھے تو
تعجب کی کون سی بات ہے۔

میں پہلو بدل کر سیدھا ہو بیٹھا۔ میرا
دل اِس شِدّت سے دھڑک رہا تھا کہ مجھے
اپنے کوٹ کا بایاں کالر لرزتا ہوا معلوم ہوا۔ اچانک
کوچبان میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا" بابو جی
یہی سدانند گلی ہے نا؟"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھکر کہا" ہاں
یہی ہے"

لڑکی بولی" تھوڑا سا اور آگے"

میں نے کہا" ہاں تھوڑا سا اور
آگے"

اور جس جگہ کملا نے تانگے والے کو
ٹھہرنے کے لیے کہا وہیں میرے چچا سدانند کا
مکان تھا۔ وہ اُتری۔ دونی دے کر سامنے
ایک بہت بڑے مکان میں گھس گئی۔ اور جب
وہ پلٹ کر باہر آئی اور بولی" میں اپنا رومال
بھول گئی ہوں" ——— تو میں سمجھا جیسے
چاند بدلیوں سے نکل آیا ہے!

اور اس کے بعد وہی سلسلہ شروع ہوا
جو اِس قسم کی ملاقاتوں کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے،
اِسٹیشن سے کرشن نگر تک اِکٹھا سفر بھی ہوا ہو۔
شرمائی اور گھبرائی نظریں بھی آپس میں اُلجھی ہوں
جسم بھی مس ہو چکے ہوں۔ مکان بھی بالمقابل ہوں
تو بتاؤ۔ انتظار کاہے کا تھا۔ بس پَو پھٹی، دُھندلا
دُھندلا نور پھیلا۔ کرنوں کے تیر پھول بن کر برسے
سورج نکل آیا۔ اور پھر ہر طرف چکا چوند کا عالم تھا!

چار طرف چکا چوند کا عالم!

ہمیں وقت نے اپنے پیروں پرچاکر
بٹھا دیا۔ ہمیں محسوس تک نہ ہوا کہ ہم اندھیرے
اُجالے کے بے شمار خطّے عبور کر آئے ہیں۔ اور
قریب ہے کہ دھرتی کے باسی ہمیں شک و شبہ
کی نگاہوں سے دیکھنے لگیں!

اور آخر بوڑھے وقت کی ازلی فطرت
برروئے کار آئی، اُس نے اپنے پر جھٹک دیئے
اور ہم وہیں آگرے، جہاں سے ہماری پرواز
کی اِبتدا ہوئی تھی۔

پتاجی کی کسی قارونِ ثانی سے مڈبھیڑ
ہوگئی، جس نے میرے لیے اپنی لڑکی پیش کردی
میں ایک بار قصداً اُسے دیکھنے لارنس باغ میں
جانکلا۔ میں نے اُسے ایک رَوش پر ٹہلتے دیکھا۔

موٹی اور بھدّی! جیسے انگریزی اخباروں بوڑھی
میموں کے کارٹون ہوتے ہیں، چہرے پر تہ بہ تہ
غازہ۔ کانوں کے قریب تستری کی شکل کے بڑے
بڑے کلیوں کا چھتہ! آدھ فٹ چوڑے پاؤں میں
آدھ فٹ اونچی ایڑی کی گرگابی! مجھے گمان ہوا
جیسے میں فینسی ڈریس شو دیکھ رہا ہوں!

تم جانتے ہو، میں اپنے پتاجی کا بہت
اِحترام کرتا ہوں، عام رواج سے بھی زیادہ
—— اور پھر اُن سے ڈرتا بھی ہوں، مجھے
اُن کے حکم کی تعمیل سے کبھی اِنکار نہیں ہو سکتا۔
وہ اِن دنوں یہیں آئے ہوئے ہیں۔ اُنھوں
نے چچا سدانند سے میری شادی کا ذکر کیا، میں
ساتھ والے کمرے میں بیٹھا سب کچھ سن رہا تھا
گھبرایا گھبرایا آیا اور کہا: "میں اُس بھینس سے
شادی نہیں کروں گا۔"

پتاجی اور چچا پر سکتہ کا سا عالم طاری
ہوگیا۔ مجھ ایسے سعادت مند بیٹے کی زبان سے
وہ اِس قسم کے گستاخانہ کلمات سُننے کے لیے
قطعاً تیار نہ تھے۔ پتاجی کچھ دیر سوچ کر بولے
"کیوں؟"

میں نے کہا: "میں اُس جان کے عذاب
سے بیاہ رچا کر اپنے آپ کو ہلاک نہیں کرنا چاہتا
میں ابھی زندہ رہنا چاہتا ہوں۔"

میرے اِتنے بے باک تیور دیکھ کر اُن کی
حالت غیر ہوئی جا رہی تھی۔ بولے: "بھنگ پی کر تو
نہیں آئے؟"

میں نے کہا: "آپ جو چاہیں فرمائیں۔
پر میں جان بوجھ کر آگ میں کیسے کود دوں؟"

آہ بھر کر بولے: "تم سے یہ اُمید نہ تھی
نند بیٹا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تم اپنے بوڑھے
پتا کی آشاؤں کی پروا نہ کرنا بھی جانتے ہو!"

فقرہ نہایت موزوں تھا۔ اور بہت
مؤثر لیکن جب میں اپنی آنکھوں سے اِس چلتی پھرتی
چٹان کو دیکھ آیا تھا۔ تو یہ کیسے برداشت کر لیتا
کہ اُسے پھولوں کی گٹھڑی سمجھ کر سر پر اُٹھا لوں
مجھے معلوم تھا۔ کہ ایسا کرنے سے میری کمر ٹوٹ
جائے گی!۔

اِس کے بعد وہی سلسلہ شروع ہوا جو
باپ بیٹے کی اِس قسم کی ناخوشگوار گفتگو کے بعد
شروع ہو جایا کرتا ہے، خاندان کی بڑی بوڑھیاں
جالندھر اور لائل پور سے بھاگی آئیں۔ بڑی
لمبی لمبی تقریریں ہوئیں۔ میرے سر پہ ہاتھ
پھیرے گئے، مجھے مستقبل کا زمردیں دربار
دکھایا گیا۔ مگر کسی کے کہنے سے میں ہیرا کیسے چاٹ
لیتا! بے بہا چیز سہی مگر زہر ہے آخر۔

میرے مسلسل انکار کی تاب نہ لا کر

آج صبح پتاجی نے مجھے اپنے پاس بلایا اور بولے۔
"آخر تم شادی کرو گے بھی یا نہیں۔ وہ کون اندر
کے اکھاڑے کی پری ہے، جو تمہارے من میں
بس رہی ہے، بتاؤ۔ کوئی چھترانی بھی ہوئی تو میں
انکار نہیں کروں گا۔ بس۔ میری آشاؤں کا دَم
گھٹ چکا ہے۔"

کملا اپنا سفید ڈوپٹہ اوڑھے میرے
تصور کے پردے پر نمودار ہوئی۔ گول چہرہ۔
مرمریں بازو۔ آنکھیں جیسے گنگا جل کی کٹوریاں
ان پر دراز پلکوں کی قطار۔ اور پھر ان پلکوں
کے سائے رخساروں سے گزر کر ٹھوڑی کو
چھوتے ہوئے! جہاں دو ننھے ننھے مبہم سے
گڑھے کپکپا رہے تھے! میری پسلیوں میں جیسے
کسی نے کہنی ماردی!

خاندان کے سب افرادِ جمع تھے۔
بڑی بوڑھیاں مجھے گھور رہی تھیں۔ نوجوان
دیویاں دانتوں میں انگلیاں دبائے سوچوں
میں غرق تھیں۔ اور میں چپ چاپ کھڑا پتاجی
کے سوال کا موزوں جواب سوچنے میں مصروف
تھا۔

اچانک پتاجی نے میرے بازو کو
جھنجھوڑا ــــــ "بتاؤ نند" ــــــ ان کی
آواز تھرتھرا رہی تھی۔ شاید وہ آنسوؤں کو روکنے
کی کوشش کر رہے تھے "بتاؤ بیٹا۔
کوئی چھترانی بھی ہوئی۔ کوئی شودرنی بھی ہوئی تو
میں اُس سے تمہارا وواہ کردوں گا۔ بتاؤ۔"

. . . .

. . . . . .

یہاں آکر نند رک گیا۔ اُس کے ہونٹوں
پر وہی مغموم مسکراہٹ کھیلنے لگی، جو مجھے بہت
محبوب ہے، سنترے کے درخت کے تنے سے
وہی دو ٹڈے اُتر رہے تھے۔ زمین پر آکر انھوں نے
اپنے منہ ملائے۔ اور پھر ایک اُتر کی طرف چل دیا۔
اور دوسرا دکھن کی طرف!

نند نے مسکرا کر کہا۔ "یہ میرا ڈراما
کھیلا جا رہا ہے، ٹڈے نند اور کملا کا ناٹک
کھیل رہے ہیں۔"

میں نے گھبرا کر پوچھا، "کیوں نند۔
پھر کیا ہوا؟"

"پھر؟" وہ بنچ کے روغن کو ناخن
سے کھرچتے ہوئے بولا: "بس میں نے کہہ دیا
کہ میں کملا سے شادی کروں گا۔ ۔ ۔
"کون کملا؟ کون کملا؟" ــــــ ہر طرف سے
صدائیں آنے لگیں۔ میں نے کہا،" وہ جو سامنے
کے مکان میں رہتی ہے!"

ہر طرف آسیبی سکوت چھا گیا۔ پتاجی نے

کاندھے پر پڑی ہوئی چادر کو اپنی بغل میں دبالیا اور اُٹھتے ہوئے بولے: "پر اُس سے تمہارا وواہ نہیں ہوسکتا!"

میں نے چلا کر پوچھا: "کیوں؟"

جاتے ہوئے بولے: "وہ بیوہ ہے"

. . . .

. . . .

نند اور میں باغ سے نکل کر اب ایک سڑک پر آگئے، چپ چاپ ہم دُور تک چلتے گئے، اور آخر ایک جگہ نند رُک گیا۔ میرے دونوں شانوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر بولا: "جس عورت کی پلکوں کے سائے ہر وقت اُس کے رخساروں پر پڑے رہیں۔ وہ یقیناً بیوہ ہوگی"

میں اُس سے اِس عجیب وغریب قیاس آرائی کے متعلق چند سوالات پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر اچانک فضا پر قوسی پلکوں کا ایک بادل سا چھا گیا!

ہمارے سامنے سے ایک ارتھی گذر رہی تھی!

قطعہ

شرابِ انوار تابکے یوں پیالۂ فانوس جام سے گری
یہ برق نظارہ سوز کب تک قیام بالائے بام سے گری
ہزار پردوں میں تم چھپے ہو اے میری نظریں تجھے پہچانیں
بیچارہ کام جذبۂ دل، تو پھر نظر از مقام سے گری

فیض جھنجھانوی

دمِ واپسیں

ایک ضعیفہ کو بحالتِ کس مپرسی دَم توڑتے ہوئے دیکھکر

حضرت فیض جھنجھانوی

نظر تھی کہ موجِ مئے کامرانی — نفس تھا کہ پیغمبرِ زندگانی
کبھی دل تھا آئینۂ حسن و الفت — مگر اب وہی جنتِ شادمانی
تغیر بکف انقلاب آفریں ہے
دمِ واپسیں ہے دمِ واپسیں ہے

مسرت کہانی تبسم فسانہ — سمندِ سکوں پر نظر تازیانہ
دگرگوں ہے رنگِ رخِ ارغوانی — مذبذب ہے حالِ دلِ والہانہ
فلک سربزانو، مکدر زمیں ہے
دمِ واپسیں ہے، دمِ واپسیں ہے

سراپا تباہی مجسم ہلاکت — یہ صبحِ سفر ہے کہ شامِ قیامت
کھنچی جا رہی ہے طنابِ رگِ جاں — بجھا جا رہا ہے چراغِ بصارت
نظر مخبرِ غم دل اندوہگیں ہے
دمِ واپسیں ہے، دمِ واپسیں ہے

فضا گرد آلود، تاریک راہیں — جگر دوز نالے غم اندوز آہیں
خوشی سر برہنہ سکوں سربزانو — تھکا سا تنفس بجھی سی نگاہیں
سحر دم بخود شام چیں برجبیں ہے
دمِ واپسیں ہے، دمِ واپسیں ہے

وہ اٹھا نقابِ رخِ بے ثباتی — وہ آئی عروسِ قضا مسکراتی

فضائیں مکدر ہوائیں پریشاں — نفس کپکپاتا نظر تھرتھراتی

سکوں مضطرب زندگی خشمگیں ہے

دمِ واپسیں ہے، دمِ واپسیں ہے

نظر سوز رنگِ رخِ بے وفائی — جگر دوز شمشیرِ بے اعتنائی

یہ آنکھیں چراتا ہوا سا زمانہ — یہ نظریں بدلتی ہوئی سی خدائی

غم ہم نفس، شکوہ ہم نشیں ہے

دمِ واپسیں ہے دمِ واپسیں ہے

غزالِ نظر دامِ شرمندگی میں — شبِ تار دامانِ تابندگی میں

سرِ زندگی نقشِ پائے قضا پر — سنانِ قضا سینۂ زندگی میں

زمیں فتنہ پرور فلک نکتہ چیں ہے

دمِ واپسیں ہے دمِ واپسیں ہے

ہوائیں مکدر فضا پر اداسی — فلک بھوکا بھوکا زمیں پیاسی پیاسی

دھواں چھن رہا ہے سامِ سحر سے — ہر اک چیز پر چھا رہی ہے گھٹا سی

نگاہیں کہیں، رخ کہیں، دل کہیں ہے

دمِ واپسیں ہے دمِ واپسیں ہے

کفِ بے کسی میں دلِ خود نمائی — درِ بے رخی پر سرِ آشنائی

بسکتی ہوئی شمعِ بزمِ تجمل — تڑپتا ہوا لاشۂ دل ربائی

تجلی سیہ پوش زہر آگیں ہے

دمِ واپسیں ہے دمِ واپسیں ہے

خیالِ مقدم نہ فکرِ مؤخر — غمِ راہ زن ہے نہ احسانِ رہبر

عجب شان سے جا رہا ہے مسافر — نظر جانبِ شافعِ روزِ محشر

تخاطب سوئے احکم الحاکمیں ہے

دمِ واپسیں ہے دمِ واپسیں ہے

خواتینِ مصر

جناب محمد حسن الاعظمی

مصر ترکیہ کی طرح مشرق و مغرب دونوں کی تہذیب و تمدن سے متاثر ہوا ہے اور وہاں کے تمدن نے اِن دونوں تہذیبوں کے امتزاج سے ایک نئی شکل اختیار کر لی ہے جسے مصری تمدن کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اُس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ مصر کا اپنا ذاتی تمدن کوئی نہیں ہے۔ در اصل مصری تہذیب و تمدن پر قدیم فراعنہ کے تمدن کا نمایاں اثر موجود ہے۔ مصر کی معاشرتی زندگی زیادہ تر مغربی ہے۔ چنانچہ مصریوں کا لباس بھی بجز لال ٹوپی کے مغربی انداز کا ہے۔ وہ کوٹ پتلون اور نکٹائی کے ساتھ سُرخ ٹوپی پہنتے ہیں۔ جسے وہاں کی زبان میں طربوش کہا جاتا ہے۔ طربوش مصری زندگی میں اِتنی اہمیت حاصل کر چکی ہے کہ تمام سرکاری ملازموں کو خواہ وہ مصری ہوں یا غیر مصری طربوش ضرور پہننی پڑتی ہے۔ چنانچہ تمام یورپین بھی یہی ٹوپی پہنتے ہیں۔ اور مصری خواتین کا لباس فراعین مصر کے زمانے کی خواتین کے لباس کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے جو مغربی لباس سے ملتی جلتی ہے لیکن جس میں مغربی عُریانیت نہیں۔

جنگ کے پہلے مصر میں بھی ہندوستان کی طرح پردے کا شدت سے رواج تھا۔ وہاں کی عورتیں بھی گھر کے لوگوں کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے باہر نہیں جا سکتی تھیں۔ وہاں کی عورتوں کے لیے بھی خرید و فروخت کے لیے نکلنا معیوب تھا۔ اور تعلیم نسوان کا کوئی معقول انتظام نہ تھا وہاں بھی جن اور بھوت نسوانی دُنیا پر حکمران تھے اور سماجی و تمدنی زندگی نہایت قابلِ افسوس و ملامت تھی۔ وہاں کی عورتوں کی بھی صحت بہت خراب ہوتی تھی اور وہ بیماری کی ہر وقت شکار رہتی تھیں اور نتیجہ کے طور پر

اُن کی اولاد کمزور۔ توہم پرست اور جاہل ہوتی تھی۔ تشکیلِ قوم یا کسی ملی تحریک میں وہاں کی خاتون بھی کبھی شرکت نہیں کرتی تھی اور اُس زمانے کے علما، اُنھیں ترقی کی راہ بتانے کے بجائے اپنی تنگ نظری کی وجہ سے پستی و ذلت کی طرف لے جانے میں ممد و معاون تھے اور یہی وجہ تھی کہ خواتین مصر کے لیے اس زمانے میں کوئی موزوں درسگاہ نہ تھی۔ اور جب کبھی کوئی دُور اندیش شخص تعلیم نسواں کی تحریک کرتا تو تنگ نظر علما، کا ایک گروہ اس کی مخالفت میں اندھا دُھن کھڑا ہو جاتا جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ساری قوم غلامی کی لعنت میں مُبتلا تھی۔ آخر کار قاسم بک امین نے عورتوں کے حقوق منوانے اور اُن کو آزادی دلانے کا بیڑا اُٹھایا اور اِس مقصد کے حصول کے لیے کئی مُدلل کتابیں شایع کیں جن میں حُریت و تعلیم نسواں کی ضرورت و اہمیت پر بحث کی اور حُریت نسواں کو اپنی زندگی کا نصب العین اختیار کر لیا موصوف کو کئی مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ اپنے ارادے پر ایک چٹان کی طرح جمے رہے آخر مصریوں کو ہوش آیا اور اُنھوں نے محسوس کیا کہ جس طرح لڑکوں پر تعلیم فرض ہے ویسے ہی لڑکیوں پر۔ چنانچہ لڑکیوں کی تعلیم کا خاطر خواہ بندوبست بھی ہوا اور

آج مصری یونیورسٹی کے کئی کالجوں میں بہ کثرت لڑکیاں تعلیم حاصل کر رہی ہیں بلکہ کئی ہونہار لڑکیاں پروفیسر بھی بن گئیں ہیں۔ اور بہت سی غیر معمولی استعداد کی لڑکیوں کو عراق و شام کی درسگاہوں میں بطور پروفیسر و معلّمہ بھیجا گیا ہے۔ جو بہت کامیابی سے اپنے فرایض انجام دے رہی ہیں اور عربی کی اِشاعت کر رہی ہیں۔

جامعہ ازہر کی طرف سے لڑکیوں کے لیے تعلیم و تربیت کا خاص انتظام کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں قاہرہ کے ایک خوبصورت حصے میں حال ہی میں حکومت نے لڑکیوں کے لیے ایک نئی قسم کا ادارہ قایم کیا ہے اِس میں شریف لڑکیوں کو اُمور خانہ داری کی تعلیم دی جاتی ہے اور اُنھیں بتایا جاتا ہے کہ چھوٹے بچوں کی کس طرح پرورش کی جائے اور اُنھیں کس قسم کی تعلیم و تربیت دینی چاہیے۔ سہیلیوں اور مہمانوں سے مِلتے وقت کون سے آداب برتنے چاہیں۔ گفتگو کِس طریقے پر ہونی چاہیے۔ کن عادتوں کو ترک کرنا اور کن کو اِختیار کرنا چاہیے اِس کے علاوہ طالبات کو پڑھنے لکھنے اور صنعت و حرفت کی بھی تعلیم دی جاتی ہے اور وزرا و اُمرا اور زعماء کی بیگمات بھی اوقاتِ فراغت میں

بلا جھجک اِس تربیت گاہ سے اِستفادہ کرتی ہیں۔
اِس درسگاہ کا نام معہد التربیۃ للبنات ہے
اور اس کی صدر معلمہ کو الناظرہ کہتے ہیں۔

یتیم اور غریب بچیوں کو تعلیم دینے
کے لیے اِصلاحیۃ الاحداث کا اِدارہ جامعہ
مصریہ کے بالمقابل الجیزہ میں قایم ہے اِس کی
شاخیں قناطر خیریہ اور طرہ کے علاوہ کئی اور
شہروں میں بھی قایم ہیں اور اُس کے پرنسپل
یا ڈائرکٹر مصر کے ایک قابل فوجی اُفسر حیدر پاشا
ہیں۔ اِس مدرسے میں آٹھ یا دس سال کی تعلیم
و تربیت کا اِنتظام ہے۔ مختلف علوم کے علاوہ
بعض صنعتیں بھی سکھائی جاتی ہیں۔ قاہرہ کے
مرکزی اِدارہ میں آٹھ سو لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں۔
علماء ازہر کی بیٹیاں بھی اَب جامعہ مصریہ اور دیگر
جدید قسم کے تعلیمی اداروں میں داخل ہیں۔ علامہٗ
مصطفیٰ مراغی شیخ الاسلام کی لڑکیاں تعلیم نسواں
کی تحریک میں پیش پیش ہیں۔ اور لڑکیوں کے لیے
تعلیم اِتنی ضروری ہوگئی ہے کہ اَب اَن پڑھ لڑکیوں
کے لیے شوہر نہیں ملتے۔

مصری خواتین کی ترقی کا زمانہ جنگ
عظیم کے اِختتام سے ملحق ہے۔ زعیم مصر سعد
زغلول اور مصطفیٰ کامل پاشا اور بیگم زغلول اُم المصریین
نے اس میں بڑا حصہ لیا۔ نیز جدید ترکیہ نے مصری
خاتون پر خاص اثر کیا اور مصر کی علمی ترقی اور سیاسی
آزادی بڑی حد تک خواتین کی مرہون منت ہے
اور موجودہ مصری خاتون کی ترقی میں سماجی ناولوں
معاشرتی اَفسانے و ڈراموں اور علمی نسوانی رسائل
نے خاص حصہ لیا اور اب تعلیم نسواں اور پَردہ
کے متعلق مصریوں کا نظریہ پہلے سے بالکل جدا ہے
اور ازہر جدید کے علماء بھی اُن کے ہم نوا ہوگئے
ہیں اور عام طور سے مصری عورتیں گھر والوں
کے ہمراہ سیرگاہوں میں تفریح کے لیے اور
بازاروں میں خرید و فروخت کے لیے جاتی ہیں
البتہ ایک چادر اَوڑھ لیتی ہیں یا اپنا سر ڈھانپنے
کے لیے ایک سیاہ باریک رومال سر پر لپیٹ
لیتی ہیں۔ اور مصریوں کا عقیدہ ہے کہ یہی عین
اسلامی پَردہ ہے جس کے ثبوت کے لیے وہ
کئی دلیلیں پیش کرتے ہیں۔

مصریوں میں شادی کا طریقہ نہایت
مناسب اور سودمند ہے اور اس میں مغربی
اور مشرقی دونوں رواجوں کا ملاپ نظر آتا ہے
وہاں بھی رشتے اکثر گھر کی بزرگ خواتین کی
معرفت ہوتے ہیں۔ لیکن لڑکے اور لڑکی سے
مشورہ ضرور کیا جاتا ہے۔ اگر انھوں نے
ایک دوسرے کو نہ دیکھا ہو تو ایک دعوت میں
اِن دونوں کو اور کنبے کے دوسرے لوگوں کو

بلایا جاتا ہے تاکہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ سکیں اس کے بعد اگر دونوں کو منظور رہو تو عارضی سگنی ہو جاتی ہے۔ پھر تقریباً چھ مہینے سال بھر کے لیے دونوں کو سوچنے کا موقع دیا جاتا ہے اور کنبے کے لوگوں کے سامنے ملنے جلنے اور باتیں کرنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ تاکہ وہ ایک دوسرے کی طبیعتوں کا اندازہ کرلیں، اگر کچھ عرصے کے بعد فریقین میں سے کسی کو دوسرے کا مزاج اور طبیعت پسند نہ آئے تو منگنی ٹوٹ جاتی ہے اس رواج کی وجہ سے گھر کے لڑائی جھگڑوں اور طلاقوں میں بہت کمی واقع ہو جاتی ہے اور ازدواجی زندگی نہایت کامیاب رہتی ہے۔

آخر میں ہم مصر کی بعض اہم اور مشہور خواتین کا تذکرہ کرتے ہیں تاکہ ہماری تقریر تشنہ نہ رہ جائے اُن میں سے سب سے زیادہ مشہور محترمہ سیدہ ہدیٰ حانم شعراوی ہیں جو ایک نہایت دولت مند اور تعلیم یافتہ خاتون ہیں انھیں قاسم بک امین کی جانشین کہا جا سکتا ہے کیونکہ اُنھوں نے قاسم امین کے خیالات کی تبلیغ میں اپنی عمر صرف کر دی ہے۔ جب ہندوستان یا کسی دوسرے ملک سے کوئی خاتون مصر آتی ہے تو محترمہ ہدیٰ حانم شعراوی اس کا لکچر کراتی ہیں اور مصری خواتین سے تعارف کراتی ہیں۔ آپ کے مضامین وہاں کے مشہور رسالوں اور اخباروں میں چھپتے رہتے ہیں۔

مصر میں عام رواج ہے کہ عام جلسوں اور علمی اجتماعات میں مرد اور عورتیں سب اکٹھے ہوتے ہیں لیکن ہال میں مرد اور عورتوں کے لیے کرسیاں مخصوص کر دی جاتی ہیں۔

وہاں کی مشہور خواتین میں آنسہ زینب الحکیم بھی ہیں آپ مشہور ادیبہ ہیں عراق میں پروفیسر رہ چکی ہیں ان کے مضامین اکثر ادبی رسالوں میں چھپتے رہتے ہیں۔ اور اُن کا مقصد عورتوں کی آزادی اور تعلیم ہے آپ کے مقالات کا کافی اثر ہوتا ہے۔ آج کل آپ قاہرہ میں رہتی ہیں۔

اِن مشہور خواتین میں آنسہ سہیر القلماوی ہیں۔ آپ جامعہ مصریہ میں اُدب کی پروفیسر ہیں آپ نے اپنی تعلیم جامعہ مصریہ ہی میں حاصل کی تھی۔ اور اسی کے خرچ پر یورپ جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ انگریزی اور فرانسیسی میں کافی لیاقت رکھتی ہیں۔ مجلت الثقافہ میں ان کے مضمون شایع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا میلان افسانہ نگاری کی طرف ہے۔ آپ عورتوں کی تعلیم و آزادی کی زبردست حامی ہیں۔ [مصر کی

مشہور لڑکیوں میں آنسہ بنت الشاطئی ہیں اور یہ
مصر کی سب سے کم عمر ادیبہ ہیں اُن کی عمر بیس سال
سے زاید نہیں۔ ازہر کے ایک شیخ کی دختر اور ڈاکٹر
طٰہٰ حسین کی شاگرد ہیں۔ چند سال قبل جامعہ مصریہ
کے کلیۃ الآداب سے یم، اے کی ڈگری حاصل
کی ہے۔ آپ تحریر و تقریر دونوں میں طاق ہیں
اجتماعیات پر کئی کتب لکھ چکی ہیں اور تعلیمی مناظروں
اور مباحثات میں اکثر حصہ لیتی ہیں۔ آپ مستقبل
میں مصر کی سب سے بڑی مقررہ ثابت ہوں گی۔

مصر کی مشہور بیگمات میں السیدہ انصاف
ہیں جو کلیۃ الآداب کے سابق پرنسپل ڈاکٹر
منصور بک فہمی کی زوجہ محترمہ ہیں۔ آپ شبرا ہائی
اسکول کی صدر معلمہ ہیں۔ اور یہ پہلی خاتون ہیں
جنھیں اِس عہدے پر فائز کیا گیا ہے۔ اِس
مدرسے کی اکثر طالبات اَب جامعہ مصریہ میں
تعلیم پا رہی ہیں۔ موصوفہ نے اپنے علم کی تکمیل
انگلستان میں کی اور وہاں سے فن تعلیمات کی
اعلیٰ سند حاصل کی۔ آج کل تعلیم نسوان میں
بہت دلچسپی لے رہی ہیں۔ اُن کی ایک کتاب
روضۃ الاطفال مدرسوں کے نصاب میں
داخل ہے۔

اِن مشہور بیگمات میں السیدہ احسان
احمد القوص مدرسۃ المعلمات کی نائب
پرنسپل ہیں آپ ایک بہت بڑے خاندان سے
تعلق رکھتی ہیں۔ جب آپ مدرسے میں پڑھتی
تھیں تو آپ اول درجے میں پاس ہوئیں اور
وزارت معارف نے اُنھیں اپنے خرچ پر یورپ
بھیجنا چاہا تاکہ یہ اعلیٰ تعلیم حاصل کریں لیکن صحت
خراب ہونے کی وجہ سے اُن کے والدین نے
اِس پیش کش کو منظور نہ کیا۔ ۱۹۲۵ء میں آپ نے
پانچ سال کی تعلیم کے بعد جامعہ امریکیہ بیروت
سے تعلیم کی آخری سند حاصل کی۔ بیروت میں
آپ طلبہ کے مباحثات میں حصہ لیا کرتی تھیں۔
ایک تقریری مقابلے میں اُنھیں اول آنے پر
ڈیڑھ سو پونڈ کی رقم پیش کی گئی جو اُنھوں نے یہ
کہہ کر واپس کر دی کہ یہ رقم کسی غریب کی فیس
ادا کرنے کے لیے مختص کر دی جائے۔ آپ
ایک مشہور مقررہ ہیں۔ چنانچہ جب مصر کے مشہور
شاعر احمد شوقی بک مرحوم کو امیرالشعرا کا خطاب
دینے کے لیے ایک جشن ہوا اور اس میں مختلف
تقریریں ہوئیں۔ تو اُن میں اُن ہی کی تقریر بہترین
قرار دی گئی۔ آپ وطنی سیاست سے بھی دلچسپی
لیتی ہیں۔ چنانچہ لجنۃ الوفد للسیدات کی سکریٹری
اور جمعیۃ المراۃ الجدیدہ کی نائب صدر رہی ہیں
آج کل آپ الاتحاد النسائی المصری کی سکریٹری
ہیں۔ آپ نے نئی تعلیم کے فلسفے پر ایک رسالہ

بھی تصنیف کیا ہے جو تعلیمی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا ہے۔

مصر کی مشہور خواتین میں آنسہ مَیّ زیادہ ایک مشہور ادیبہ شاعرہ اور مقررہ ہیں۔ آپ لبنان شام کے ایک تعلیمی ادارے میں پڑھتی تھیں۔ لبنان کو جزیرۃ العرب کا کشمیر کہا جاسکتا ہے۔ اس جگہ کے حسین وجمیل قدرتی مناظر دیکھکر آپ بہت متاثر ہوئیں اور آپ فرانسیسی زبان میں شعر کہنے لگیں سنہ ۱۹۱۱ء میں ازھار الحلم یعنی (خواب کے پھول) کے نام سے اپنی نظموں کا مجموعہ شایع کیا جو بہت مقبول ہوا۔

آپ عربی زبان میں بہت کمزور تھیں بعض صاحب ذوق مصریوں نے انھیں کہا کہ کاش آپ عربی جانتیں اور اس زبان میں شعر کہتیں۔ چنانچہ آپنے عربی کی تعلیم جامعہ مصریہ سے حاصل کی اور عربی شعر بھی اچھے کہنے لگیں۔ انشاء اور اَدب میں آپ بہت ماہر ہیں اور مصر کی ان عورتوں میں شمار کی جاتی ہیں جنھیں اُنگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ ان کی مشہور کتاب رجوع الموجہ ہے جو عربی میں لکھی گئی ہے۔

دور جدید کو سنوارنے میں اُن خواتین نے نمایاں حصہ لیا ہے اور اُن کے لگائے ہوئے باغ سے اَب ہزاروں ماہرات سیاست و اَدب تیار ہورہی ہیں اور جدید مصر کی عمارت کے اِستحکام میں نوجوانوں کا ہاتھ بٹا رہی ہیں۔

" اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ جس قوم میں عورت کا درجہ محض فرضی طور پر بلند ہے مگر در اصل ذلیل ہے وہ قوم صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح ہٹ جائے گی "

(باجازت نشرگاہ لاسلکی حیدرآباد)

آگاہی

جناب ساغر نظامی مدیر "ایشیا"

اے ہم نفس غلام سوادِ چمن نہ ہو گل بوسیٔ دام پہ یوں خندہ زن نہ ہو

کانٹوں سے بھی بہار میں غافل نہیں ہوں میں

ساحل ہے میرے بحر کا ساحل سے دور تر منزل ہے میرے شوق کی منزل سے دور تر

سرمست دلفریبیٔ منزل نہیں ہوں میں

کیا کرسکیگی گردش دوراں مری گرفت کیا کرسکیگا ذہن حریفاں مری گرفت

خود اختیاریوں کو بھی حاصل نہیں ہوں میں

تاریخ بحر میں ہے مری شورشوں کا حال بکھرا ہوا ہے سینۂ طوفاں پہ میرا جال

گرداب ہوں تحمل ساحل نہیں ہوں میں

فطرت مری مقابلہ و جہد و جنگ ہے میری ہر ایک رگ میں رواں روح سنگ ہے

جس کو زمانہ توڑ دے وہ دل نہیں ہوں میں

جو اینڈتی ہیں دیر سے موسم کے بطن میں جو اُٹھ رہی ہیں دیر سے موسم کے بطن میں

اُن آندھیوں کے شور سے غافل نہیں ہوں میں

محسوس کر رہا ہوں کناری پہ بھی دھواں طوفاں کی شورشوں کا نہیں صرف ازدہا

ساحل کی خامشی سے بھی غافل نہیں ہوں میں

پانچواں کالم

جناب علی امام بلگرامی - ایم - اے

پانچویں کالم کا نام سب سے پہلے اسپین کی خانہ جنگی کے موقعے پر سُنا گیا - یہ وہ موقعہ تھا جب اسپین کے دارالخلافہ پر جمہوریوں کی آخری جد وجہد کا خاتمہ ہونے والا تھا اور فاشزم کی جیت جنرل فرانکو کے سر سہرا باندھنے جا رہی تھی - چار طرف سے فرانکو کے سپاہی میڈرڈ کا محاصرہ کر رہے تھے اور فاشی سیاہ بادلوں کے دَل کے دَل اُمنڈتے چلے آ رہے تھے جمہوری فوج بھی آزادی اور مساوات کے تحفظ کے لیے جانیں گنوا رہی تھی - اسی وقت جنرل فرانکو نے کہا کہ شہر میڈرڈ پر چار طرف سے اس کے چار کالم حملہ کر رہے ہیں اور اُس کا پانچواں کالم خود شہر میں موجود ہے اور گھریلو محاذ کو کمزور کر رہا ہے - چنانچہ اسی زمانے سے پانچویں کالم کا بدنام لقب اِن غداروں کو دیا جانے لگا جو ملک سے غداری کریں اور دشمن سے اِشتراکِ عمل کرکے فوجی اور عوام کے محاذ کو کمزور بنائیں - لیکن اِس فقرہ اور اس کی ہمہ گیری کی تفصیل لطف سے خالی نہ ہوگی خاص کر جب یہ کہا جائے کہ پانچویں کالم کا ذہنی وجود اِس واقعے سے بہت قبل موجود تھا -

اُنیسویں صدی کے وسط میں جب یورپ کے تمام ممالک میں قومیت پرستی کا دور دورہ تھا اور ملک گیری اور نوآبادیات کے لیے دوڑ دُھوپ جاری تھی ہر ملک میں سرمایہ پرست طبقہ فروغ پر تھا - تجارتی مفاد اور موجودہ نظام کو برقرار رکھنے اور اس میں اِضافہ کے لیے سرمایہ داری اور سرمایہ پرست لوٹ کھسوٹ کو خاص دَخل تھا - نئی نئی صنعتوں کے کھلنے، مشین کی بہتات، اور ملک کے زاید سرمایے کے دوسرے ممالک میں مصرف کا یہ نتیجہ ہوا کہ

یورپ میں ایک خاص ذہنیت کا نشو و نما ہوا جسے
قومیت کہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ملک گیری کا جذبہ
برسرِاقتدار اور حاکم طبقے کو نچلا نہیں بیٹھنے دیتا۔ جس کا
نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کے ایک ملک کا سرمایہ پرست
طبقہ دوسرے کا دشمن ہوگیا۔ ملکوں کے مفاد
ایسے ٹکرائے کہ اُنیسویں صدی کے آخر تک یورپ
کی سرزمین میدانِ کارزار بنی رہی۔ تجارتی مفاد
نے ہر ملک کو دوسرے کے مدِ مقابل لا کھڑا کیا۔
انگلستان، فرانس، اور جرمنی خاص کر اور اسپین،
پرتگال، اور ڈنمارک دوسرے درجے پر ایک
دوسرے کے زبردست حریف بن گئے۔ نوآبادیات
کو اپنے قبضے قدرت میں لانے اور "غیر مہذب"
عوام کو غلام بنانے میں ہر حریف ایک دوسرے
سے بازی لے جانے میں کوشاں ہوگیا۔ چنانچہ
حریفانہ چشمک اور تصادم خیز مفاد بڑھتے بڑھتے
اِس حد پر پہنچے کہ بیسویں صدی کے آغاز پر تمام
دنیا کو ایک جنگ عظیم کا خطرہ محسوس ہونے لگا۔
جنگ اصل میں ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی لیکن
اِس کا مواد پہلے ہی سے پک رہا تھا۔ جرمن میں
چنگاری لگنا باقی تھی ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم یورپ
کیا تمام دُنیا کے سرمایہ پرست طبقوں کی باہمی
عداوت کا نتیجہ تھی۔ علاوہ بریں یہ ایک ایسی
ملوکیت پرست جنگ تھی جس کے اختتام پر ہر
ملک خلیفۃ الارض ہونے کا متمنی تھا۔

لیکن قبل اِس کے کہ جنگ کا اختتام ایک
ملک کی شکست اور دوسرے کی فتح میں نمودار ہو
ایک عجیب واقعہ کا ظہور ہوا جس نے دنیا کی سیاست پر
نہ صرف گہرا اثر ڈالا بلکہ بین الاقوامی سیاسی توازن
بدل دیا۔ اُس نے انسانی ذہن اور ملکی اصولوں
کو تبدیل کر دیا یہ روس کا انقلاب تھا۔ روس کے
عوام اور مزدوروں نے جنگ سے تنگ آ کر
انقلاب کر دیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ موجودہ
جنگ سرمایہ دارانہ مفاد کے لیے لڑی جا رہی
تھی۔ عوام کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ
عوام کیوں آپ کو گردن کٹوانے کے لیے پیش
کریں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ جنگ کے اختتام
پر عوام کی حالت اور بھی اَبتر ہو جائے گی۔ اگر
رُوس کا انقلاب ایک مقامی واقعے سے زیادہ
حیثیت نہ رکھتا تو شاید اِس قدر جلد بین الاقوامی
سیاست نہ بدلتی۔ مگر روسی انقلاب کے شعلے
یورپ کی طرف بڑھنے لگے۔ آسٹریا، ہنگری،
بلقانی ریاستوں، پولینڈ اور خود جرمنی میں انقلابی
آگ بھڑک اُٹھی اور حاکم طبقہ نیست و نابود کیا
جانے لگا۔ سرمایہ داروں نے جب یہ دیکھا
تو فوراً جنگ بند کر دینا پڑی اور جنگ کے بعد
اُنھوں نے دوبارہ اپنی پُرانی ساکھ قایم کرنے کی

کوشش کی۔ لیکن پرانے ڈھانچے پر نئی عمارت
تیار کرنا غیر ممکن تھا۔ دوسرے یہ کہ انقلاب روس
نے سماجی طبقوں کے تعلقات میں ایک انقلاب
عظیم پیدا کر دیا تھا۔ روسی انقلابیوں نے مزدور
اتحاد کے لیے "دُنیا کے مزدور و متحد ہو جاؤ" کا
نعرہ بلند کیا تھا۔ اس نعرہ کی قبولیت بھی بڑھتی
جا رہی تھی۔ جب ملک کے عوام اور محنت کش اپنے
سرمایہ دار طبقوں کے ہاتھوں زار و نزار تھے
تو اُنھیں کیا ضرورت تھی کہ قومیت جیسے بیکار
مسلک پر کاربند رہیں اور دوسرے ممالک کے
عوام کا گلا کاٹنے کے لیے سرمایہ پرست طبقہ
کا ساتھ دیں۔ ہاں اگر خود ان کے ملک کا سرمایہ
پرست طبقہ اُن کے ساتھ مراعات کرے تب تو
لفظ قومیت بھی شرمندۂ معنی ہو سکتا ہے۔ یہ تھے
افکار جن کا تسلسل قایم ہونے لگا اور ایسا معلوم
ہوتا تھا کہ دُنیا کے عوام متحد ہو جائیں گے۔

ذہنی افکار کے ساتھ ساتھ انسان
کی خارجی ضروریات اور سائنس کی ایجادات
نے بھی قومیت جیسے بے معنی لفظ کی وقعت
لوگوں کے دلوں سے کم کرنا شروع کر دی سائنس
کی ترقی نے ملکوں کے باشندوں کو ایک دوسرے
سے قریب تر کر دیا۔ ریل، ہوائی جہاز، تار برقی،
ریڈیو وغیرہ کی وجہ سے ممالک ایک برادری
میں شامل ہونے لگے۔ چند منٹوں میں ایک
جرمنی کا رہنے والا نیویارک کے حالات سے
واقفیت حاصل کرنے لگا۔ انسان کی خارجی
ضروریات اس قدر گھل مل گئیں کہ اگر امریکہ
کے کسی بنک کے حصوں کا نرخ بڑھتا تو ہندوستان
پر اس کا اثر پڑتا۔ آمد و رفت اور رسل و رسائل
کے ذرایع اس قدر عام ہو گئے کہ امریکہ اب
یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ دُنیا کا حصہ نہیں ہے اور
یورپ کی سیاسی حالت سے اُسے دلچسپی نہیں ہے
اس کے ساتھ ساتھ آلات حرب میں بھی ترقی
شروع ہوئی۔ قومیت نے یورپ اور دوسرے
ممالک کو ملکی حدود میں تقسیم کر دیا تھا۔ جنگ
فوجیوں کے درمیان پرانے طریقوں پر ہوتی
تھی لیکن گزشتہ جنگِ عظیم کے آخر ہوتے ہوتے
ہوائی جہاز اور ٹینک بھی ایجاد ہو گئے تھے۔
اس طرح آلاتِ حرب نے سائینس کی مدد سے
ملکی حدود کو بھی توڑ دیا اِن تمام وجوہ (ذہنی،
خارجی ضروریات، سائینس کی ترقی وغیرہ)
نے قومیت کے نظریہ کو مسترد کر کے بین الاقوامی
تعلقات کی بنا پر بنی نوع اِنسان کو منقسم کر دیا۔
ایک ملک کا مزدور اگر دوسرے ملک کے مزدور
کو اپنا ساتھی تصور کرنے لگا تو اسی ملک کے
سرمایہ دار نے بھی دوسرے ملک کے سرمایہ دار کو

اپنا ساتھی بنالیا۔

"دُنیا کے مزدور و متحد ہو جاؤ" پر مزدور طبقہ تو اِس قدر کاربند نہ ہو سکا ہاں سرمایہ دار طبقہ نے ضرور اس سے سبق سیکھا۔ جنگ عظیم کے اِختتام پر اس کو احساس ہوا کہ باہمی عداوت کا نتیجہ کہیں رُوس جیسا نہ ہو اور عوام ملکی سیاست اور اِقتصادیات پر قابض ہو جائیں۔ چنانچہ بین الاقوامی سرمایہ داری میں باہمی مفاہمت شروع ہوئی اور حریفانہ چشمک اور تجارتی مقابلہ بازی کے بجائے مجلس اقوام جیسے اِدارے قایم کیے گئے اور لوکارنو جیسے معاہدے ہوئے جو سرمایے داری کے مفاد کو تصادم سے بچائیں۔ خاص کر ۱۹۲۹-۳۳ء کی بین الاقوامی اِقتصادی اَبتری کے بعد اس کی ضرورت زیادہ محسوس کی جانے لگی۔ یہ وقت سرمایے داری کے اِمتحان کا تھا۔ ہر ملک میں صنعتی مال بھرا پڑا تھا لیکن اشیا کے نرخ گھٹائے نہیں جاتے تھے۔ کھانے کی اشیا کے گودام جلا دیئے جاتے یا سمندر کی نذر کر دیئے جاتے لیکن ملک میں لاکھوں اِنسانوں کو صرف ایک وقت کھانا ملتا۔ بے روزگاری بڑھ رہی تھی۔ ہر ملک اِنقلابی کروٹ لے رہا تھا۔ عوام میں بے چینی بڑھتی جا رہی تھی ایسے ہی وقت سرمایہ داروں نے فاشزم کو فروغ دیا اور سرمایہ داری کے ڈوبتے سفینہ کو غرق ہونے سے بچالیا۔ فاشزم نے توپ اور بندوق کی مدد سے مزدوروں کی جد وجہد اور تحریکوں کو ختم کیا، مذہب رنگ نسل اور قومیت کا راگ الاپ کر بین الاقوامی رشتہ کو توڑا اور عوام کے اُمڈتے ہوئے سیلاب کو دوسری طرف بہا دیا۔ اگر فاشزم کا عروج نہ ہوتا تو سرمایے داری کی کاغذی ناؤ زیادہ عرصہ تک نہیں چل سکتی تھی۔ سرمایے داری کے سامنے دو سوال تھے۔ فاشزم یا اِنقلاب ظاہر ہے کہ اِنقلاب خود سرمایے داری ہی کو ختم کر دیتا چنانچہ فاشزم کو فروغ دیا گیا۔

اِس ذرا طویل پس منظر کے جائزہ کے بعد ہم اِس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ذہنی طور پر سرمایہ پرست طبقہ ایک دوسرے کے ہم مشرب تھے خواہ اُن کا نظامِ حکومت فاشی ہو خواہ غیر فاشی اِس لیئے اگر ایک ملک کے سرمایے دار طبقہ کو ملک کے عوام سے خطرہ پیدا ہو جائے تو وہ دوسرے ملک کے سرمایے دار طبقہ سے مدد لیتا ہے اور اِس خطرہ کو رفع کر دیتا ہے۔ یہی ہے پانچویں کالم کا ذہنی وجود۔ اَب آیئے ذرا دورِ حاضرہ پر نظر ڈالیں۔

جرمنی میں ہٹلر، اٹلی میں مسولینی، اور اِسپین میں فرانکو کا عروج شخصی آزادی پر ڈاکہ

خیال کیئے جانے کے بجائے تحسین کی نظروں سے دیکھا گیا اور سرمایہ دار طبقے نے ہر طرح اس کو مدد بہم پہنچانے کی کوشش کی۔ چونکہ سرمایہ داری برقرار رکھنے کے لیے فاشزم ایک آخری ہتھیار تھا اس لیے اُس کو فروغ دینا بھی سرمایہ داری کا فرض ہوگیا۔ تاریخ عالم کے ورق ورق پر اُس کی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً جرمنی پر جنگی قرضے کی معافی، جرمنی انگلستان کا بحری معاہدہ، امریکہ کا جرمنی میں روپیہ بھیجنا، اسپین اور حبشہ کے معاملے میں انگلستان اور فرانس کی عدم مداخلت کی پالیسی، ہتھیار بندی روکنے کی ناکام کوشش وغیرہ وغیرہ۔

پانچویں کالم کی ذہنیت یعنی فاشزم نوازی بڑھتی رہی۔ ہر ملک میں سرمایہ دارانہ مرکزیت اور بے روزگاری کی وجہ سے انقلابی جدوجہد جاری تھی۔ بعض بعض جگہ سرمایہ دار طبقوں کے فنا ہونے تک کا خطرہ تھا۔ ایسی ہی حالت میں فاشزم سے ہمدردی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ اسپین کی جمہوری ریاست پر فاشیت نواز فرانکو کے جارحانہ حملے کے وقت انگلستان اور فرانس کی عدم مداخلت کس قدر شرمناک تھی۔ خاص کر ایسی حالت میں جب کہ فرانکو کی امداد کے لیے اٹلی اور جرمنی فوجیں، ٹینک اور ہوائی جہاز بھیج رہے تھے۔ اِس کا سبب یہ تھا کہ اسپین کی جمہوری ریاست میں روز بروز ایسے اِصلاحات ہو رہے تھے اور ریاست کی اِقتصادی نوعیت اِس طرح بدلتی جارہی تھی کہ بین الاقوامی سرمایہ پرستوں کا خیال تھا کہ وہاں بھی اشتراکی طرز کی حکومت کا قیام ہو جائے گا۔

فاشزم نہ صرف رجعت پسند نظریہ زندگی ہے، عسکریت کو فروغ دیتا ہے اور عوام کی تحریکوں کو جبر و تشدّد سے دبا دیتا ہے بلکہ وہ ایک تنگ نظر ذہنیت ہے جو پرانی روایات اور پرانی معاشرت کو جدید زندگی پر فوقیت دیتا ہے اور انسانی ترقی و تمدّن کا دشمن ہے سائنس دانوں کا شہر بدر کر دینا، نئی آرام دہ ایجادات کو روک کر محض جنگی ایجادات کرنا، عقلیت پرستی پر پابندیاں، نئے اُصولوں پر دوا علاج کو مذموم نگاہوں سے دیکھنا، اور جدید تہذیب و تمدّن کی مذمت کرنا، فاشی جرمنی کے پسندیدہ کارنامے ہیں۔ علم الطب اور اور علم جراحی میں جس قدر ترقیاں ہوئیں اور جتنے بھی مشہور عالم اور سائنس داں جرمنی میں پیدا ہوئے سب کے سب فاشزم کے عروج سے قبل کے تھے۔ اس کے آتے ہی اُنھیں جرمنی سے نکال دیا گیا۔ چنانچہ کس قدر تعجب کا

مقام ہے کہ بین الاقوامی سرمایہ دار طبقہ اور جرمن
جنگر اس قدر اندھا ہوگیا کہ فاشزم کی اُن تمام
بدنما صورتوں کے باوجود اپنی عوام دشمنی کے نشے
میں سب کو جائز قرار دیتا رہا۔ اور نہ صرف جائز
قرار دیتا رہا۔ بلکہ اُس کا ذہنی رجحان بھی اُسی
طرف ہوگیا۔

ہٹلر اِس ذہنیت سے خوب واقف
تھا۔ اس کی کتاب "میری جدوجہد" میں
اِس مسئلہ پر نہ صرف خیال آرائی کی گئی ہے بلکہ
اُس پر پُورا پُورا یقین تھا کہ ہر سرمایہ پرست
ملک میں فاشزم کے ہمدرد موجود ہیں۔ چنانچہ
نازی پارٹی کا ایک رکن رکین روشنگ اپنی
کتاب "ہٹلر اسپیکس" میں کہتا ہے کہ ہٹلر نے
ایک روز اپنی جماعت کی قبولیت کا ذکر کرتے
ہوئے کہا "دیکھو روشنگ! ہر ملک میں ہمارے
ہمدرد موجود ہیں۔ جب ہماری فوجیں مثلاً فرانس
پر حملہ کریں گی تو پیرس سے فرانیسی فوجیں ہماری
وردیاں پہنے ہوئے نکلیں گی اور ہمارا ساتھ
دیں گی"۔ یہ ۱۹۳۳ء کی بات تھی۔ لیکن ہٹلر نے
کس قدر صحیح کہا تھا ۱۹۴۰ء میں جب جرمنی نے
فرانس پر حملہ کیا تو فی الواقع وہاں فاشزم کے
ہمدرد موجود تھے۔ یہ امر فرانس کے ایک
سرکاری مسودے "زرد کتاب" سے عیاں
ہو جاتا ہے۔ جنگ کے قبل تک جرمنی اور فرانس
میں جو جو خط و کتابت ہوئی ہے وہ بعینہٖ اِس
میں درج کر دی گئی ہے۔ اِس کتاب کے ہر
ہر ورق میں اِس کا ذکر موجود ہے کہ فرانس
جرمنی سے مصالحت کرنا چاہتا تھا اور اپنے
یہاں بھی فاشی حکومت کے قیام ہی میں نہ صرف
اپنا مفاد بلکہ سرمایہ داری کا مفاد دیکھتا تھا۔ وہاں
کی فاشی نوازی اظہر من الشمس ہے۔ جنگ سے
بہت قبل ہی اُس نے فرانس میں فاشی دوست
تحریک شروع کی تھی۔ جب جرمنی نے فرانس پر
حملہ کیا تو اسی ذہنیت کی بدولت فرانس محض
پندرہ دن میں کھیت رہا۔ فرانس جیسی بڑی ریاست
کی اس کمزوری نے دنیا والوں کی آنکھیں کھول
دیں۔ لوگ سمجھتے تھے کہ فرانس کی فوجی طاقت
اِس قدر کمزور تھی کہ ہٹلر کے تیز حملوں کا مقابلہ
نہ کر سکی۔ لیکن یہ امر کہ یگوسلاویہ جیسا چھوٹا اور
کمزور ملک فرانس سے زیادہ عرصہ تک نازیوں
کا مقابلہ کرتا رہا اِس حقیقت کو فاش کر دیتا ہے
کہ فرانس میں نہ تو جنگی تیاری کی گئی تھی اور نہ
جرمنی کے خلاف دفاعی تدبیریں ہی سوچی گئی
تھیں۔ جنگ کے آغاز پر فرانیسی حکومت
نے یہ اعلان کیا تھا کہ فرانس دو سو خاندانوں
کی حفاظت کے لیے لڑ رہا ہے۔ یہ ٹھیک تھا

کیونکہ فرانس کی شکست کے بعد بھی یہی دو سو حاکم
خاندان وہاں برسر اقتدار ہیں۔ ہاں عوام ضرور
کچل دیئے گئے۔ فرانس کے حاکم طبقہ کو یہی منظور
تھا۔ پیٹر نیو لائن اس وقت بیکار تھی جب تک کہ
ملک میں جنگی فضا، نہ پیدا کی جاتی لیکن حکومت کو
ڈر تھا کہ جنگ کے طول کھینچنے میں عوام کی حکومت
برسر اقتدار آجائے گی جرمنی سے مقابلے کے لیے
فرانس میں انقلاب ہوجائے گا۔ ظاہر ہے کے
انقلاب کبھی بھی سرمایہ داری کو نہ چھوڑتا۔
فرانس کے جنگی پس و پیش کا اندازہ اس سے
لگتا ہے کہ ملک کی بہترین الپائن فوج جو ایک
لاکھ کے لگ بھگ تھی جنگ میں شامل نہ کی
گئی اور حملے کے اٹھارہ روز بعد جو پہلا اور آخری
حکم اُسے ملا وہ یہ تھا کہ الپائن فوج توڑ دی گئی
فرانس کے حکومتی طبقے نے یہ طے کرلیا تھا کہ وہ
جنگ کو طول دے کر اپنے ملک میں اِنقلاب
نہیں لانا چاہتا۔ چنانچہ ہٹلر کے سامنے سر جھکا
دیا۔ لوال اور پیتاں جیسے فاشی دُوست
فرانس میں موجود تھے جن کا شمار ملک کے
سر برآوردہ سرمایہ پرست ہستیوں
میں تھا۔

کم و بیش دوسرے ملکوں میں بھی
یہی ہوا۔ ڈنمارک، ہالینڈ، اور ناروے میں
موسرٹ اور کوئزلنگ جیسے فاشی موجود تھے
یہاں بھی موجودہ نظام کو برقرار رکھنے کے لیے
فاشزم قبول کرلی گئی۔ ہر ایسے ملک میں حملے
ہوتے ہی مزدوروں کے لیڈروں اور کمیونسٹوں
کو جیل بھر دیا گیا تاکہ عوام میں جنگی فضاء نہ پھیلے
اور فوجی کمزوری دکھا کر اور ناحق کشت و خون
کے بہانے سے ملک کو فاشیوں کے حوالے
کر دیا جائے۔ یورپی ممالک میں صرف انگلستان
ہی ایسا ملک تھا جہاں جمہوری روایات کی
بنا پر عوام نے اپنی رائے منوا کر چھوڑی اور
چیمبرلین جیسے رجعت پسندوں کو ہٹا کر قومی حکومت
بنائی گئی۔ صرف یہی نہیں بلکہ انگلستان جمہوریت
پرستوں اور فاشی دشمنوں کا ایک قلعہ بن گیا
جس نے بین الاقوامی فاشی دشمن محاذ کو ترتیب
دینے میں خاص حصہ لیا۔

فاشزم ایک بین الاقوامی چڑیا ہے
جو ہر ملک میں اپنے انڈے دیتی ہے۔ چونکہ
یہ ایک ایسا نظریہ زندگی ہے جو موجودہ فرسودہ
اور رجعت پسند نظام کو قایم رکھنا چاہتا ہے۔
اِس لیے حاکم سرمایہ پرست طبقہ اُس کا ساتھ دیتا
ہے۔ اور ذہنی طور پر فاشزم کا ہمدرد ہے
خواہ اپنے بیانات میں اور منظر عام پر اُس کی
مذمت ہی کیوں نہ کرے۔ ہمارے ملک میں بھی

فاشی رجحانات کا بہت زور ہے اور ملک کی ایک بڑی جماعت کانگریس نے اپنی فاشی نوازی کا ثبوت دے دیا ہے۔ اگر کانگریس کی ذہنیت اور جماعتی اصولوں پر ہم نظر ڈالیں تو صاف نظر آجائے گا کہ وہ فاشزم سے کتنی ملتی جلتی ہے۔ وہی رجعت پسندی، پرانی عظمت کا ترانہ یعنی رام راج، مہاتما کی ہٹلر کی طرح پرستش، عام ممبروں کی خالی الذہنی اور اندھی تقلید، ہندوستانی سرمایہ داروں کا اثر وغیرہ وغیرہ۔ کانگریس کے تمام بڑے بڑے رہنما جرمنی، اٹلی اور جاپان کی عظمت کے راگ جنگ سے قبل اور جنگ شروع ہونے کے بعد بھی الاپتے رہے۔ جنگ کے آغاز پر اُنھوں نے حکومت سے عدم تعاون کیا اس لیے نہیں کہ حکومتِ ہند فاشزم کے خلاف اعلان جنگ کر کے بھی ملک کو جنگ کے لیے تیار کرنا نہیں چاہتی بلکہ اس لیے کہ کیوں اُس نے بغیر پوچھے ملک کو جنگ میں جھونک دیا۔ لیکن کانگریس نے تو جنگ کے قبل ہی اپنے مختلف اجلاسوں میں علانیہ طور پر اور پُر زور الفاظ میں فاشزم کے خلاف رائیں پاس کی تھیں۔ پھر کیا وجہ تھی کہ حکومت کے اعلان جنگ کرنے کے بعد وہ پیچھے ہٹ گئے۔ اگر کانگریس کے اجلاسوں کی تجاویز اُن کے رہنماؤں کے دلی جذبات اور جمہوری اُصولوں کی ترجمانی کرتیں تو یہ کس قدر اچھا موقعہ ہاتھ آیا تھا کہ حکومت کے ہر شعبہ اور محکمہ میں داخل ہو کر کانگریسی رہنما اپنی فاشی دشمنی کا ثبوت دیتے اور ملک کو دشمن کے حملے سے بچانے کے لیے عوام کی ایک زبردست تحریک شروع کرتے۔ نہ تو وائسرائے اور نہ وزیر ہند ہی اُنھیں اُس سے روک سکتے تھے اس طرح نہ صرف ہندوستانی عوام بین الاقوامی فاشی دشمن محاذ کو مضبوط کر کے فاشزم جیسے رجعت پسند لیکن طاقتور ادارے کو توڑ دیتے بلکہ ملکی آزادی بھی حاصل ہو جاتی۔ لیکن کانگریسی رہنماؤں کے قول و فعل میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ گذشتہ اگست کی توڑ پھوڑ والی تحریک اس کا بین ثبوت ہے کہ جاپان کی ہمدردی میں کانگریس ایسی فضا پیدا کرنا چاہتی تھی کہ حملے کے موقعے پر ملک بے حد کمزور ہو جائے، جنگی دفاعی تدابیر بے کار رہیں، اور جاپان کا ملک پر قبضہ ہو جائے۔ یہی پانچویں کالم کی ذہنیت ہوتی ہے۔

لوگ عموماً غداروں کو پانچویں کالم اور پانچویں کالم کو غدار ہی کہتے ہیں۔ لیکن ان دونوں میں بیحد فرق ہے۔ غدار ملک کے اُن افراد کا مجموعہ ہے جو دُشمن کے خلاف جنگ کرتے کرتے آخیر وقت میں کسی لالچ کی بنا پر دُشمن سے جا ملیں۔ لیکن شروع میں وہ خلوص دل اور نیک نیتی سے دشمن کے خلاف

لڑتے ہیں۔ غداروں کی نہ تو کوئی تنظیم ہوتی ہے اور نہ پہلے سے وہ کوئی اسکیم ہی بناتے ہیں۔ لالچ اُن میں یک بیک تبدیلی پیدا کر دیتا ہے۔ دشمن سے غداروں کی ذہنی مطابقت ہونا بھی ضروری نہیں۔ چند سیاسی مفاد کی بنا پر وہ غداری کرتے ہیں۔ لیکن پانچویں کالم کی باقاعدہ ایک تنظیم ہوتی ہے اور وہ مختلف طریقوں اور اداروں کے ذریعہ دشمن کے حق میں پروپیگنڈہ کرتا رہتا ہے گھریلو محاذ کو کمزور کرنے کے لیے عوام میں بے اطمینانی اور خوف دلاتا ہے۔ کشت و خون سے ڈر کر اُن کی ہمتیں پست کرتا ہے اور جنگ شروع ہوتے ہی ملکی جنگی تیاریوں، رسل و رسائل اور دفاعی تدبیروں کی خبر دشمن کو دیتا رہتا ہے۔

پروازِ خیال

حضرت شعری بھوپالی

بیٹھے ہیں شرط کرکے ترے آستاں سے ہم
تقدیر کو بدل کے اُٹھیں گے یہاں سے ہم

سُنتے رہے وہ قصۂ بربادِ آرزو،
کہتے رہے ادا اس نظر کی زباں سے ہم

اے دل یہ بزم حُسن ہے یہ آستانِ ناز
اب تیرا ساتھ چھوڑ رہے ہیں یہاں سے ہم

للہ اپنی مست نگاہی کو روکیئے
ٹکرا نہ دیں زمین کو کہیں آسماں سے ہم

اس شرم سے نہ دیر وحرم کی طرف گئے
لوٹے تو کیا کہیں گے ترے آستاں سے ہم

آغوشِ بیخودی میں کسی کو لیے ہوئے
بیٹھے ہیں دور سرحدِ کون و مکاں سے ہم

اے برقِ حُسن دل کی نزاکت کا بھی خیال
واقف نہیں ہیں معرکۂ امتحاں سے ہم

صیاد چلتے چلتے بس اِک آخری نگاہ
پھر جیتے جی مِلے نہ ملے آشیاں سے ہم

سرمستیٔ جنون محبت نہ پوچھیئے،
اکثر گزر گئے ہیں زمین و زماں سے ہم

آغازِ عشق ہجر تھا، انجام عشق ہجر
یعنی ابھی وہیں ہیں چلے تھے جہاں سے ہم

شعری گزر گیا ہے اِک ایسا بھی دورِ عشق
کچھ سرگراں سے وہ رہے کچھ بدگماں سے ہم

افلاطون شاعروں کا دشمن تھا

از جناب ڈاکٹر سید سجاد۔ ایم، اے، پی ایچ ڈی

یہ ایک صحیح واقعہ ہے افلاطون نے شاعری انسان کے لیے بے سود اور مہمل مشغلہ قرار دیا ہے، اردو زبان میں گو اَب خاص کر جنگ عظیم کے بعد سے ہر قسم کا اَدب پیدا ہونے لگا ہے، اور اَدب کے ہر شعبہ پر لکھنے والے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ لیکن دنیا کے اُس قدیم مفکر کی عداوت شعر پر کسی نے خاطر خواہ روشنی نہیں ڈالی، چالیس پچاس سال تک مولانا حالی مرحوم نے اپنے دیوان کا مقدمہ تالیف فرمایا۔ اور اس میں شعر و سخن پر جو معرکۃ الآرا تنقید لکھی اُس کے آغاز میں سرسری طور پر اُفلاطون کا ذکر کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:۔

"افلاطون نے جو یونان کے لیئے جمہوری سلطنت کا ایک خیالی ڈھانچہ بنایا تھا اُس میں شاعروں کے سوا ہر پیشہ اور ہر فن کے لوگوں کی ضرورت تسلیم کی تھی"۔

اُفلاطون کی خیالی سلطنت کا تفصیلی حال اُس کی کتاب جمہوریہ یا ری پبلک میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے ہم اِس مقام پر اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ اس حکیم نے اپنی قوم کے لیئے ایسا نظام حکومت تیار کیا تھا جس میں خیر کا زیادہ سے زیادہ ظہور ہوتا رہے اور قوم کے اَفراد فارغ البالی اور نیکی سے زندگی بسر کر سکیں، اس میں افلاطون نے اپنے ملک کے لوگوں کے ہر طبقہ اور ہر قسم کے مشغلہ سے بحث کی ہے۔ اور اس کی اچھائی اور برائی کو غائر نظر سے دیکھا ہے اِس سلسلہ میں شاعری اور شعراء کی باری بھی آئی ہے۔ ایک طولانی بحث کے بعد وہ اِس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ فن شعر سوسائٹی کے لیئے مضر ہے اِس لیئے وہ شاعروں کو ملک سے بدر کر دیتا ہے۔ مگر کتاب کے اواخر میں اُس نے اپنی رائے کو کچھ بدل دیا ہے،

اُن کے فن پر دو ایک شرطیں عائد کرکے شعراء کو
وطن واپس آنے کی اجازت دیدی ہے۔

دراصل شعراء پر پہلے پہل افلاطون
کے اُستاد سقراط نے حملہ کیا تھا۔ سقراط سچ کا زبردست
حامی تھا اور شاعروں کے متعلق اُس کا یہ خیال تھا
کہ یہ لوگ اپنے تخیل اور واقعہ نگاری میں راہ صداقت
سے بھٹک جاتے ہیں، ایک شے اپنی اصلیت
میں کچھ ہوتی ہے اور یہ کچھ سمجھ بیٹھتے ہیں اور کچھ
سے کچھ سمجھانے لگتے ہیں، افلاطون نے ری پبلک
میں نہ صرف اِس خیال کی تائید کی ہے بلکہ شعراء
کے خلاف ایک مستقل فردجرم ترتیب دی ہے
مگر افلاطون محو بالطبع شاعر تھا، موزونیت اس
کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی باتیں کرتے
کرتے اشعار اس کی زبان سے ٹپک پڑتے
تھے، اس کے مشہور مکالمات میں جلسے کے جلسے
موزوں اور ڈرامائی طرز پر واقع ہوئے ہیں،
وہ یونان کے بعض شاعروں کا مداح بھی تھا
ایس کائی لس کو محض اس کی شاعری کی وجہ سے
افلاطون نے 'دیوتا' کا خطاب دیا تھا، سوفوکلیز
کے شاعرانہ خیالات اور ساحرانہ بیان کی دل سے
قدر کرتا تھا، اس کے باوجود وہ شاعروں کا دشمن
تھا، اس کے اسباب میں متعدد چیزیں بیان کی جاتی
ہیں، ایک سبب یہ تھا کہ افلاطون کے زمانہ حیات
میں یونان کی شاعری مائل بہ انحطاط ہوگئی تھی، اس کے
سابق آئین اور حدود کو تنگ کردیا تھا، صرف ایک
موضوع پر شاعری کا انحصار رہ گیا تھا، اس کا نام
ڈرامہ تھا اور ملک میں اس کا چوطرف چرچا تھا، ہر کس
وناکس ڈرامائی شاعری کا دم بھرتا تھا، تھیٹر پرستی
نے ہر شخص کی توجہ جذب کرلی تھی علم و فضل کا چراغ
گل ہوگیا تھا، اہل علم اور ذی لیاقت لوگ ناپید
ہونے لگے تھے پرستش الفاظ اور قافیہ پیمائی نے
حقیقی شاعری اور صحیح ادب کی جگہ لے لی تھی! افلاطون
کے ایک معاصر شاعر نے اس زمانے کے شاعرانہ
افکار کو "چڑوں کی چون چون" سے نسبت دی ہے
مگر اس معاصر نے خود پر غضب کیا۔ کہ سقراط اور اس کے
حکیمانہ مسلک کی ہجو لکھ کر خاک اڑائی اور حکمائے
یونان نے آئینی حکومت کا جو خاکہ تیار کرکے ادارۂ
پارلیمنٹ کو وجود بخشا تھا اس کی بھی خوب خبر لی
اور اس کا نام "زنانہ ایوان" رکھا۔ اِن باتوں سے
افلاطون نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ شعر و حکمت ایک دوسرے
کی ضد ہیں چنانچہ اس نے شعر کا ساتھ چھوڑ دیا اور
فلسفہ کی حمایت پر تُل گیا۔

افلاطون کی دشمنی کا دوسرا سبب یہ تھا کہ
ڈرامہ کے رواج سے یونان میں اداکاروں کی ایک
نئی جماعت پیدا ہوگئی تھی اداکار اپنی فطرت چُراکر
اپنی ذات میں دوسرے کی فطرت بھر لیتا ہے، افلاطون

اس حالت کو زوال یا ابتذال فطرت قرار دیتا ہے، وہ کہتا ہے کہ ایک شخص متعدد سیرتوں کی زندگی بسر نہیں کر سکتا، زندگی، ایک ہی ڈراما ہوتا ہے، کئی کئی ڈراما نہیں ہو سکتے، اداکار اپنے پیشہ کے فرائض میں جن اجنبی سیرتوں کو قبول کرتا ہے اُن سے خود اس کی سیرت برباد ہو جاتی ہے اور اُس کی ذات میں کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہتی جسے وہ اپنی کہہ سکے، نہ یہ ممکن ہے کہ آدمی اپنی ایک زندگی خود بھی برتے اور اس کو دوسروں کے عمل کے لیئے بھی کام میں لالئے، اداکار اپنے فن کا غلام ہوتا ہے اس کا آقا نہیں ہوتا۔

افلاطون کے ان خیالات کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ڈرامہ گو شاعروں کو برا سمجھتا تھا اور خصوصاً ایسے شعراء کو جو شکوہ الفاظ، رنگینی عبارت اور تشبیہ و استعارات کو شاعری کی اصلی رونق شمار کرتے ہیں اور ایسے ہی شاعروں کو اس نے اپنی خیالی سلطنت سے جلاوطن کیا تھا۔ اس زمرہ میں نہ یونان کا ہومر داخل ہے نہ دوسرے بڑے بڑے شاعر جن کی مثنویاں رزم و بزم مشہور ہیں، اس کے سوا، ڈرامہ نویس اور اُس کی شاعری ایسی بری چیز نہیں ہے اور نہ اس کی تصویر ایسی تاریک اور بھیانک، جو افلاطون کو نظر آئی، ڈرامہ کے ذریعہ شکسپیر اور گوئٹے نے سیرت کے ایسے ایسے نفیس اور بے مثل نمونے قلمبند کیئے ہیں جن کی تعریف صدیوں سے ہوتی چلی آئی ہے، یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ڈرامہ کا اداکار ایسا سیرت فروش نہیں ہوتا جیسا کہ افلاطون نے کہا ہے، جب وہ کسی دوسرے شخص کے جذبات و خیالات اور حالات کو اپنے اوپر طاری کر لیتا ہے اور جب وہ اس کے تیور اس کے لب لہجہ اور نقل و حرکت کی نقل کرتا ہے تو اس سے ایک تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کی اپنی مستقل سیرت میں یہ خاصہ اور یہ وسعت موجود ہے کہ اس میں ایک اجنبی اور غیر طبیعت سما سکتی ہے دوسرے یہ کہ اداکاری میں اس کی اپنی سیرت گم نہیں ہوتی ہے، وہ خلاق کی حیثیت سے مصنوعی سیرت کے عقب میں ہر وقت موجود رہتی ہے اور اپنی مخلوقات اداکاری کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے تاکہ وہ ایک خاکہ سے کم و بیش نہ ہونے پائیں۔ اداکار نقالی میں متواتر خلاقی بھی کرتا جاتا ہے گویا غلامی میں آقا کا جوہر دکھاتا جاتا ہے اور اس جوہر کو مستحکم اور فراوان کرتے کرتے وہ ایک سیرت سے دوسری اور دوسری سے تیسری سیرت پر قادر ہو جاتا ہے اور جب وہ اپنے فن کے فرائض سے فارغ ہوتا ہے تو اسکی سیرت اپنے اصلی سانچہ پر عود کر آتی ہے۔ ہمارا تو یہ خیال ہے کہ اداکار کی غلامی غلامی نہیں ہے وہ خلاقی کی ایک نوع ہے، اداکار کی نقل کسی خاص اصل کی تابع نہیں ہوتی، وہ اصل کے عام خاکہ یا عام خط و خال کی مدد میں اپنی خاص نقل تراشتا ہے جسکی اصل نقل سے باہر کہیں موجود نہیں ہوتی گویا اداکار کی نقل بجائے خود اصل کا مرتبہ رکھتی ہے، یہ غلامی نہیں ہے۔ باقی

نیا اردو ادب

وہ کتابیں جن کے بغیر کوئی لائبریری مکمل نہیں ہو سکتی

گرداب۔ از۔ احمد ندیم قاسمی۔

گرداب میں ندیم اپنے آپ کو ایک نئے اور نرالے رنگ میں پیش کر رہا ہے۔ ان افسانوں میں اس نے پربتوں اور میدانوں کی کھلی دنیا سے نکل کر موجودہ پرشور تہذیب سے گونجتے ہوئے شہروں کی زندگی کا جائزہ لیا ہے۔ ندیم کی انفرادی خصوصیات اچھوتی فن کاری اور رسیلی زبان کی جھلکیاں آپ نے اس کی نظموں، قطعوں، اور دیہاتی افسانوں میں دیکھی ہوں گی۔ اب ہندوستان کے اس جوان فکر ادیب کو نئے روپ میں دیکھیے۔ قیمت تین روپیے بارہ آنے مجلد۔ بہترین سہ رنگا گرد پوش

رنگ محل۔ از حضرت ساغر نظامی۔

رنگ محل ساغر کی رومانی نظموں، غزلوں، اور گیتوں کا نیا مجموعہ ہے۔ شعر و حکمت کا موثر امتزاج، رومانیت و واقعیت کا دلنواز مرکب، انسانی ذہن و روح کے لیے فکر و نشاط کا جدید پیمانہ، قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ مجلد رنگین گرد پوش

زندگی کے نئے زاویے۔ از رئیس احمد جعفری

یہ وہ افسانے ہیں۔ جو انسانی کردار، انسانی ذہنیت، انسانی نفسیات، اور انسانی سرشت کا نیا رخ پیش کرتے ہیں۔ یہ افسانے نہیں ہیں زندگی کی چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔ قیمت مجلد تین روپیے رنگین گرد پوش

یقین و عمل۔ موجودہ دور انتشار و بے چینی کا حل صدر جمعیتہ فلاسفہ لندن وائیکونٹ سموئیل کے قلم عالیہ ادب میں یہ بہترین تصنیف اور عدیم النظیر کتاب ہے تقریباً ساری ترقی یافتہ زبانوں میں اور سارے متمدن ممالک میں ہزارہا کی تعداد میں شایع ہو چکی ہے اردو زبان میں پہلی بار یہ تحفہ پیش کیا جا رہا ہے۔ قیمت دو روپیے چار آنے مجلد رنگین گرد پوش۔

ٹیگور اور ان کی شاعری۔ از مخدوم محی الدین ایم اے

ٹیگور کی شاعرانہ عظمت سے کون واقف نہیں ان کی شاعری نے بین الاقوامی مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ یہ شاعر مشرق پر سب سے پہلی مستقل کتاب ہے۔ دوسرا ایڈیشن۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

رئیس الاحرار محمد علی مرحوم۔ از مولانا عبدالماجد دریابادی

رئیس الاحرار مرحوم کی فطری اور ذہنی صلاحیتوں، ان کی علمی اور دماغی قابلیتوں، ان کے جوش عمل، ان کی ہمت بلند و عزم راسخ، ان کی متواتر اور مسلسل

عملی جد وجہد، اُن کے خلوص و ایثار، تواضع و انکسار،
اُن کی آزادانہ تقریر، اُن کی بلندیٔ تحریر، اُن کے
موثر و مدلل زورِ بیان کی تصویر ذاتی علم و تجربہ کی بنا پر
ہندوستان کے سحر نگار ادیب مولانا عبدالماجد صاحب
دریابادی نے کھینچی ہے۔ اور اس طرح کھینچی ہے کہ
کوئی خد و خال چھوٹنے نہیں پایا۔ اس کے مطالعہ سے
کسی ہندوستانی کو محروم نہیں رہنا چاہیے۔

قیمت دو روپے بارہ آنے

مضامین عبدالماجد دریابادی۔ "مولٰنا
دریابادی کے ادبی تلاطم سے کون ناواقف ہے۔
ان کی ہر تحریر ایک سیلاب کی طرح آتی ہے اور
پڑھنے والا ایک قطرے کی طرح اس میں شامل ہو کر
شریکِ سیلاب بن جاتا ہے۔ وہ اس سیلاب میں تھپیڑے
کھاتا ہے۔ موجیں اُس کو اچھالتی ہیں۔ بھنور اس کو
رقص کراتے ہیں۔ مد و جزر اس کو جلترنگ سناتے ہیں۔
اور وہ ان تمام کیفیات میں اس طرح گم ہو جاتا ہے۔ کہ
نہ قطرہ بن کر فنا ہونا یاد رہتا ہے۔ نہ حباب بن کر اُٹھنے
کا اُسے ہوش رہتا ہے۔ یہاں تک کہ سیلاب گزر جاتا ہے
اور وہ یکایک چونک کر اپنے کو محض ایک قطرہ پاتا ہے
سیلابِ مزید کے لیئے بیقرار۔ طغیانوں کا امیدوار"
یہ شوکت تھانوی کی رائے ہے۔ اس سے آپ اندازہ
کر لیجئے۔

قیمت۔ تین روپے بارہ آنے

مُردوں کی مسیحائی۔ (مقالاتِ سیرت کا مجموعہ)۔
حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے عشق و
محبت نبی صلعم میں ڈوب کر لکھے ہوئے مقالات کا
مجموعہ۔ اعلیٰ ترین کاغذ۔ قیمت تین روپیہ چار آنہ مجلد رنگین گردپوش

نغماتِ ماہر۔ از حضرت ماہر القادری۔
جوانی کی مسکراہٹیں، دوشیزگی کی انگڑائیاں،
حسن کے سدا بہار پھول، قوم و ملت کا دھڑکتا ہوا
دل، آزادی کی مضطرب روح، زندگی کی تفسیر
پاکیزہ زبان، بلند افکار، اچھوتا تخیل، عدیم النظیر
اندازِ بیان، اور وہ سب کچھ جسے شعر و ادب کی
روح کہہ سکتے ہیں۔

قیمت تین روپے مجلد رنگین گردپوش

محسوساتِ ماہر۔ از حضرت ماہر القادری۔
جذبات کے شعلے، حسن و جمال کے پھول، محبت کے
نغمے اور کوثر میں دھلی ہوئی زبان، تڑپتی ہوئی روحوں
کے لیئے سامانِ تسکین، سوتے ہوؤں کے لیے تیر و نشتر
کیف آور نظموں اور وجد آفریں غزلوں کا مجموعہ۔ (یہ
دوسرا ایڈیشن ہے) قیمت دو روپیہ بارہ آنہ

سیاستِ جاپان ۱/ از علی امام بلگرامی ایم۔اے۔ **جنگ** دو روپیہ
از اقبال حسین خاں بی۔اے۔ ام ۱/ **اقبال کا تصورِ زمان و مکان**
از ڈاکٹر رضی الدین۔ ۱۲/ **جناح کے خطوط اقبال کے نام** ۵/

ادارۂ اشاعتِ اُردو۔ عابد روڈ حیدرآباد دکن

گننے
۱
۲
۳
نوٹ کر لیجئے
نکسول
اسپیشل نکسول
امریکن سکس کریم
نکسول
اسپیشل نکسول
امریکن سکس کریم
طلاء کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ وہ بالکل صحت یاب ہو جاتے ہیں۔
آزمایش شرط ہے
خط و کتابت اور
وی پی کا پتہ
نیشن اینڈ ایلیس پراسپکٹ چیمبرس انکیس فورٹ بمبئی!!